آسان دین

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

دار الفکر الاسلامی

نام کتاب: آسان دین

مصنف: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

ناشر: دارالفکرالاسلامی

صفحات: 56

قیمت: 60روپے

طبع اول: ستمبر،2018ء

ای میل: mzubair@cuilahore.edu.pk

hmzubair2000@hotmail.com

مصنف کی کتب کے ملنے کا پتہ:

☆ عبدالمتین مجاہد:36-K،ماڈل ٹاؤن،لاہور۔0300-4199099

☆ مجلس تحقیق اسلامی،99-J،ماڈل ٹاؤن،لاہور۔042-35839404

☆ قرآن اکیڈمی،یسین آباد،فیڈرل بی ایریا،کراچی۔021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

☆ وجود باری تعالیٰ: مذہب،فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں

☆ صالح اور مصلح: کتاب وسنت اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام

☆ اسلام اور مستشرقین

☆ مولانا وحیدالدین خان: افکار و نظریات

☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ

☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

مصنف کی جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html

آسان دین

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ماڈل ٹاؤن، لاہور
ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور

دار الفکر الاسلامی

لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم
In The Name Of Allah, The Most Beneficent, The Most Merciful

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾

[الحج: 78]

”اور اللہ عزوجل نے تمہارے لیے اس دین میں کوئی تنگی پیدا نہیں کی ہے۔“

انتساب

شیخ یوسف القرضاوی کے نام

کہ جسے معاصر دینی روایت اور تحریک اسلامی میں تخلیق اور فقاہت کی تلاش ہو تو وہ انہیں پڑھ لے۔

آسان دین

دوست کا سوال ہے کہ اگر غامدی صاحب دین میں آسانی کا فتوی دیں تو وہ تو جدیدیت پسند (modernist) کہلائیں اور آپ آسانی کا فتوی دے کر بھی روایت پسند (traditionalist) رہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی؟

جواب: صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: «يسِّروا ولا تعسِّروا، وبشِّروا ولا تنفِّروا»۔ ترجمہ: لوگوں کے لیے دین کے معاملے میں آسانیاں پیدا کرو اور سختی مت کرو۔ اور لوگوں کو جنت اور معافی کی خوشخبریاں دو اور انہیں دین سے متنفر مت کرو۔ تو دین میں آسانی پیدا کرنے کے دو مفاہیم ہیں؛

ایک یہ کہ جن چیزوں میں خود دین نے رخصت اور سہولت دے دی ہے تو ان میں اپنے مزاج اور رواج کی سختی کی وجہ سے خواہ مخواہ کی سختی پیدا نہ کر لو۔ مثال کے طور پر صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ازواج مطہرات اپنے سر کے بال اتنے چھوٹے کروا لیتی تھیں کہ وہ ان کے کندھوں تک آ جاتے تھے۔ تو اب اگر کوئی خاتون اپنے بال چھوٹے کروانا چاہے تو ایسے متشدد مذہبی لوگ آپ کو مل جائیں گے جو اسے مردوں سے مشابہت کی وجہ سے ناجائز کہیں گے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ سب خواتین اپنے بال چھوٹے کروا لیں۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ جب احادیث میں رخصت ہے تو اگر کوئی کروانا چاہے تو اس پر طعن نہ کریں کہ صریح روایات کے مطابق اس کی بالکل اجازت موجود ہے۔ اور جن روایات میں عورتوں کو مردوں کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے تو اس سے مراد وہ مشابہت ہے کہ جس کی دین میں اجازت نہ ہو۔ مثال کے طور پر آج ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ عورتیں فیشن کے نام پر اپنے ٹخنے ننگے رکھتی ہیں تو کیا ہم مردوں کو ٹخنے ننگے رکھنے سے اس لیے منع کر دیں گے کہ اس سے عورتوں سے مشابہت لازم آتی ہے؟ تو اصولی بات یہ ہوئی کہ افتاء (for issuing Fatwa) کے لیے بہت ضروری ہے کہ عمومی روایات کا کوئی ایسا مفہوم نہ بیان کیا جائے کہ جس سے خاص روایات کی صراحت پر حرف آتا ہو۔

تو ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو روایت کو بالکل ہی نہیں مانتے جیسا کہ لبرلز اور دوسری طرف وہ

مذہبی طبقہ ہے کہ جس نے عمومی روایات (general guidance) کی روشنی میں دین کی ایک تصویر (image) اپنے مزاج اور رواج سے بنا رکھی ہے اور اگر صریح روایت (explicit guidance) بھی ان کے مزاج اور رواج کے دین کے خلاف آجائے تو وہ اس روایت کی تاویلیں شروع کر دیں گے لیکن اپنا مزاج اور رواج دین کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس طرح یہ لوگوں کو اللہ کے دین کی نازل کردہ رخصتوں اور آسانیوں سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتے۔ ان کا دین روایات کا دین نہیں ہے بلکہ ان کے مزاج اور رواج کا دین ہے۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سفر میں دیکھا کہ اس پر ہجوم ہے اور لوگوں نے سایہ کیا ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے؟ تو لوگوں نے بتلایا کہ اس نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ یعنی دین تمہیں کوئی پچھاڑنے تھوڑا آیا ہے، وہ تو تمہیں کھڑا کرنے آیا ہے۔ اب ایسا بھی دین پر کیا عمل کہ دین تمہیں زمین پر ہی گرا دے اور تم اس پر خوش ہوتے رہو۔ اس دین کو گرتے پڑتے راہب نہیں بلکہ کھڑے اور ڈٹے ہوئے مجاہد چاہییں۔

اسی طرح صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے موقع پر رمضان میں نکلے تھے اور روزے سے تھے۔ رستے میں آپ کو کہا گیا کہ کچھ لوگوں پر روزہ بھاری ہو گیا ہے۔ عصر کا وقت تھا، آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور سب کے سامنے پانی پی لیا۔ اس کے بعد آپ کو کہا گیا کہ کچھ لوگ آپ کے افطار کرنے کے بعد بھی روزے سے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہی میرے نافرمان ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تو یوں دین میں سخت مزاجی کو ختم کرنے کی تربیت فرمائی ہے اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ سخت مزاجی تقوی کا اعلی معیار بنا ہوا ہے کہ جو جتنا دین میں جس قدر سخت مزاج واقع ہوا ہے، اسے اتنا ہی بڑا متقی سمجھا جاتا ہے۔

پس ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صحیح اور مستند روایات میں جب واضح طور دین میں آسانی موجود ہے تو لوگوں کو وہ آسانیاں دیں اور خواہ مخواہ کی تاویلیں کر کے سختی پیدا نہ کریں کیونکہ یہ رویہ بھی روایت کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ جس طرح حرام کو حلال بنا لینا ایک جرم عظیم ہے، اسی

طرح حلال کو حرام بنانے کی کوششوں میں لگے رہنا بھی تو گناہ کبیرہ ہی ہے۔ تو لبرل اور سیکولر طبقہ حرام کو حلال بنائے گا لیکن حلال کو حرام بنانے کی توقع تو شدت پسند مذہبی عناصر سے ہی ہو سکتی ہے لہذا تصویر کے اس رخ کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تو آج کے علماء کے لیے پہلا کرنے کا کام تو یہ ہوا کہ شریعت میں جہاں آسانی ہے، وہ آسانی لوگوں کے سامنے رکھیں اور انہیں اسے انجوائے کرنے دیں تاکہ وہ دل سے اس دین کو اللہ کی ایک نعمت سمجھیں نہ کہ ایک ایسا بوجھ اور طوق جو ان کے گلے میں زبردستی ڈال دیا گیا ہو۔

اور آج کے علماء کا دوسرا کام یہ ہے کہ منہاج میں بھی آسانی پیدا کریں۔ اس کو یوں سمجھیں کہ ایک شرعی حکم ہے اور ایک اس شرعی حکم کے نفاذ کا طریقہ کار کہ جسے منہاج کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ ترجمہ: ہم نے تم میں سے ہر قوم کے لیے ایک شریعت مقرر کی ہے یعنی ضابطہ حیات (code of life) اور دوسرا منہاج یعنی شریعت کو جاری وساری کرنے کا طریق کار (way of life)۔ تو اگر ایک جگہ شرعی حکم میں سختی ہے اور اس سختی سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو اس حکم کے نفاذ (application) میں نرمی پیدا کر دیں۔ یہ بھی سنت سے ثابت ہے۔

دیور سے پردہ کرنا چاہیے، شریعت کا حکم یہی ہے۔ لیکن اگر بیوی پردہ نہیں کر رہی اور معاملہ طلاق تک آ پہنچا ہے اور خاوند مفتی صاحب سے یہ مسئلہ پوچھتا ہے کہ میری بیوی میرے بھائی سے پردہ نہیں کرتی ہے تو کیا میں اسے طلاق دے دوں؟ تو اب مفتی صاحب اس کو جواب میں یہ کہیں کہ اسے پردہ تو کرنا چاہیے اور تم حکمت سے اسے سمجھاتے بھی رہو لیکن طلاق نہ دو تو یہ منہاج میں نرمی پیدا کرنا ہے۔ یعنی آپ شرعی حکم کا درجہ (status) برقرار رکھتے ہوئے اس کے نفاذ میں کچھ نرمی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ لوگ دین سے متنفر نہ ہوں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ شریعت ہمارے مسائل حل کرنے آئی ہے، بڑھانے نہیں۔

اب آپ یہ کہیں گے کہ اس اصول کی دلیل کیا ہے کہ کسی مسئلے کے شرعی حکم کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے نفاذ یعنی منہاج میں نرمی جائز ہے؟ تو اس بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ سنن ابو داؤد کی

ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ میری بیوی کو اگر کوئی اجنبی آدمی ہاتھ لگائے تو وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی نہیں ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ اسے طلاق دے دو۔ صحابی نے کہا کہ مجھے اس سے اتنا تعلق ہے کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو پھر اس سے استفادہ کرتے رہو۔ تو اب یہاں شریعت نہیں بدلی۔ شریعت کا حکم وہی رہا ہے کہ وہ ایک فحش کام اور گناہ کبیرہ ہے اور رہے گا اور اس کی بیوی گناہ گار ہے۔ اور یہ بھی شرعی حکم ہے کہ اسے طلاق دے دو اور یہ افضل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے لہذا یہ عزیمت ہے لیکن اگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتے تو چاہے تو اس کو زوجیت میں رکھے رکھو کہ یہ رخصت ہے۔

پس شریعت ہمارے مسائل حل کرنے آئی ہے نہ کہ پیدا کرنے، یہ اہم بات ہے۔ میاں بیوی میں علیحدگی جن معاشرتی، نفسیاتی اور دینی مسائل کو جنم دیتی ہے، تو بعض صورتوں میں ان سے انسان کی نہ صرف دنیا بلکہ دین بھی جاتا رہتا ہے لہذا دین ہی کے جانے کا اگر خوف لاحق ہو تو ایسی صورت میں کم تر پر اکتفاء کر لو لیکن اپنا ایمان بچا لو۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ یہ دین، آسان دین ہے اور جس نے بھی اس دین میں سختی پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ مغلوب ہو جائے گا یعنی اپنے اس سخت دین پر عمل نہیں کر پائے گا۔

تو ہم یہ بات کر رہے تھے کہ کچھ آسانیوں کا تعلق شریعت سے ہے اور کچھ کا منہاج سے ہے، اس فرق کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے دین میں غیر ضروری احتیاط پسندی کے نام پر مذہبی تشدد نے جنم لیا۔ سنن ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے آپ ﷺ سے اپنے شوہر کی شکایت لگائی کہ وہ فجر کی نماز قضاء کر دیتے ہیں تو صفوان پاس ہی تھے تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ کیا یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ایسا ہی ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم محنت مزدوری کرنے والے لوگ ہیں لہذا صبح وقت پر جاگنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ جب جاگا کرو تو اسی وقت فجر کی نماز پڑھ لیا کرو۔ تو یہ منہاج کی نرمی ہے کہ ایک شخص کے حالات کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اس پر سختی نہیں فرمائی بلکہ اس سے دین پر جس قدر عمل ہو سکتا تھا، اسے قبول فرمایا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر اور سعودی عرب کے علماء کی ایک جماعت ایسی روایات کو اس لیے بیان نہیں کرتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ اس سے بد عملی پیدا ہو گی، لوگ فجر پڑھنا چھوڑ دیں گے۔ یہاں ہمیں ان سے اختلاف ہے کہ یہ اہل روایت کا سابقہ لاحقہ لگا کر بھی اپنے آپ کو مکمل طور روایت کے حوالے نہ کر پائے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کی حفاظت کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حساس بننے کی کوشش کی ہے اور اسی حساسیت نے ان میں عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔ بھئی، آسان سی بات ہے کہ اس رخصت کا تعلق شریعت سے نہیں ہے کہ اس کے بیان سے شریعت خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ اس کا تعلق منہاج سے ہے کہ شریعت کے نفاذ میں نرمی پیدا کر و تا کہ لوگ شریعت پر کسی نہ کسی درجے میں عمل کرتے رہیں اور اس سے زندہ تعلق محسوس کرتے رہیں۔

تو بیوی کے ڈرامہ دیکھنے سے متعلق سوال کے جواب میں جو تحریر ہم نے مرتب کی تھی تو اس کا تعلق بھی منہاج کی نرمی سے تھا نہ کہ ڈرامے کو شرعی جواز بخشنا تھا۔ اس جواب کا خلاصہ یہ تھا:

1۔ شوہر خود ڈرامہ نہ دیکھے۔ 2۔ بیوی کو ڈرامہ دیکھنے کی ترغیب نہ دیں۔ 3۔ اگر بیوی ڈرامہ دیکھتی ہے تو اسے حکمت سے سمجھا دے کہ یہ اچھا نہیں ہے یا وقت کا ضیاع ہے یا مجھے اچھا نہیں لگتا یا اس کا اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے یا اس میں یہ یہ شرعی خرابیاں ہیں۔ 4۔ اور اگر بیوی پھر بھی نہیں رکتی ہے تو سختی نہ کریں کیونکہ اس سختی سے بیوی کی اصلاح نہ ہو گی بلکہ وہ اور زیادہ بگڑ جائے گی۔

یہ میری ایک عاجزانہ رائے تھی کہ جس میں حالیہ معاشرت اور انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک رائے بیان کی گئی ہے کہ جس کے غلط ہونے کے امکان کو میں برابر طور تسلیم کرتا ہوں۔ اس لیے اگر آپ سمجھتے ہوں کہ فی زمانہ سختی سے بیوی کی اصلاح ہو سکتی ہے تو کر لیں، مجھے اس سے کیا اختلاف ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جن مذہبی گھرانوں میں اس قسم کے مسائل میں بیوی بچوں پر سختی ہوئی، وہاں رد عمل میں دین سے اور تنفر پیدا ہوا ہے لہذا میں اپنے اس مشاہدے کی وجہ سے اس طریق کار کی افادیت کا قائل نہیں ہوں۔ اور میرے نزدیک اصل کام جو کرنے کا ہے، وہ یہ ہے کہ دین کا تصور نہ بگڑنے دیں کہ حلال کو حلال ہی رہنے دیں اور حرام کو

حرام۔ بس اتنی استقامت کافی ہے کہ تصور دین میں بگاڑ نہ آنے پائے۔ لیکن جہاں تک دین پر عمل کروانے کی بات ہے تو اس میں حکمت اور نرمی کا لحاظ ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بر صغیر اور سعودی عرب کے اکثر علماء کے فتاوی میں سختی پائی جاتی ہے۔ اور جس بات پر ان دونوں کا اتفاق ہو جائے تو اس میں نرمی کی بات کرنا تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ مثال کے طور پر شلوار کو ٹخنوں سے اوپر رکھنے کا معاملہ ہی لے لیں۔ جمہور حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اگر تکبر کے ساتھ شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھے تو حرام ہے اور اگر تکبر نہ ہو تو پھر حرام نہیں کہہ سکتے بلکہ مکروہ یعنی ناپسندیدہ ہے۔ امام شافعی، امام احمد، امام ابن تیمیہ، امام ابن عبد البر، امام نووی اور امام شوکانی رحمہم اللہ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ اگر تکبر نہ ہو تو شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکانا حرام نہیں ہے بلکہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلق روایات کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ ابن مفلح الحنبلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "صاحب محیط" کے بیان کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنی چادر ٹخنوں سے نیچے لٹکا لیا کرتے تھے تو کسی نے پوچھا کہ ہمیں تو اس سے منع کیا گیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ تکبر سے نہیں ہے۔

لیکن متاخرین میں شیخ بن باز، شیخ محمد بن صالح العثیمین، علامہ البانی، شیخ صالح الفوزان وغیرہ نے شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کو مطلقاً حرام کہا ہے اور یہی قول بر صغیر کے حنفی اور اہل حدیث علماء میں جڑ پکڑ گیا۔ اب اس کے خلاف رائے لا کر تو دیکھیں، چاہے متقدمین فقہاء سے ہی کیوں نہ لے آئیں! ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ان متاخرین علماء نے یہ رائے کیوں پیش کی ہے، یہ بھی علماء ہیں، انہیں بھی اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ متاخرین حنفی اور سلفی علماء کا فتوی اگر ایک ہو جائے تو گویا وہ دین کا ایسا ورژن بن جاتا ہے کہ جس کے مقابلے میں صریح روایت بھی لے آئیں یا فقہائے متقدمین کی آراء بھی بیان کر دیں تو بھی لوگ آپ کو غامدی اور سرسید کے طعنے دینے سے باز نہیں آئیں گے حالانکہ وہ خود اپنے مزاج کی سختی یا احتیاطی مزاج کی وجہ سے دین میں سخت رائے اختیار کر رہے ہوں گے۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا

کہ مجھے معلوم نہیں تھا اور میں نے قربانی کرنے سے پہلے ہی سر منڈوالیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ کوئی حرج نہیں ہے اور اب جا کر ذبح کر لو۔ ایک اور شخص آیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا اور میں نے رمی الجمار یعنی کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر دی تو آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں، اب جا کر قربانی کر لو۔ حدیث میں ہے کہ آپ سے لوگوں نے حج کے افعال کو آگے پیچھے کرنے کے بارے میں جس قدر بھی سوال کیے تو آپ نے یہی فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی کم علمی کی وجہ سے ان کو رعایتیں دی ہیں اور ان کے لیے آسانیاں پیدا فرمائی ہیں۔ تو یہ سب احادیث کس لیے ہیں؟ برکت حاصل کرنے کے لیے؟ بھئی، یہ اس لیے ہیں کہ ہم ان آسانیوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی امت کو آگاہ کریں تا کہ انہیں معلوم ہو کہ یہ آسان دین ہے نہ کہ مشکل دین جیسا کہ فتووں کی بھر مار کے اس زمانے میں عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے۔

ابھی میرے ذہن میں بیسیوں روایات آ رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کیسے کیسے آسانیاں پیدا فرمائی ہیں بلکہ قرآن مجید کی سختی کو اپنے حکم سے نرمی میں بدلا ہے۔ قرآن مجید میں جب بیویوں کو مارنے کی اجازت نازل ہوئی تو سنن ابو داؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ بیویوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ تو کچھ عرصے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے کہ ہماری بیویاں ہم پر چڑھنا شروع ہو گئی ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد انصار کی بہت سی عورتیں ازواج مطہرات کے پاس اپنے شوہروں کی سختی کی شکایت لے کر آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا جو اپنی بیویوں پر سختی کر رہے ہیں، وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے مارنے سے منع فرما کر قرآن مجید کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ قرآن مجید کا حکم آخری درجے کا ایک استثنائی حکم (exceptional rule) تھا جس پر عمل سے عورتوں کے حق میں اس دین کے سخت ہونے کا تاثر عام ہو رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سختی کے تاثر کو ختم کرنے کے لیے بیویوں کو مارنے سے منع فرما دیا تھا تا کہ عورتیں دین سے متنفر نہ ہوں۔ تو یہاں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ دوسری شادی کے بارے میں راقم نے جو تحریریں مرتب کی تھیں، ان کا خلاصہ بھی یہی تھا کہ فی زمانہ جس قسم کے مردوں کے حالات اور اخلاق ہیں، ایسے حالات میں دوسری شادی کو رواج دینا عورتوں کو دین سے

متنفر کرنے کا سبب بن رہا ہے لہذا ایک اختیاری (optional) حکم پر اتنا زور نہ دیں کہ اسے تحریک ہی بنا دیں۔ تو کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ دوسری شادی کی تحریکیں چلانا یہ اور بات ہے اور دوسری شادی کر لینا یا کسی کو اس کا مشورہ دینا تو یہ اور بات ہے۔ دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔ اگر پہلی صورت کا کوئی انکار کر دے تو وہ کسی شرعی حکم کا انکار نہیں کر رہا ہے۔

سنن ابو داؤد کی روایت کے مطابق ایک بوڑھے شخص نے کسی لونڈی سے زنا کر لیا تو رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا کہ اس پر حد لگائیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ وہ بہت بوڑھا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ کھجور کی ایک ٹہنی لے لو کہ جس میں سو شاخیں ہوں اور اسے وہ ٹہنی ایک بار مار دو۔ تو رسول اللہ ﷺ نے زنا جیسے گناہ کی حد کے قیام میں بھی ایک شخص کے حالات کا لحاظ کیا اور اس کے لیے نرمی پیدا کی۔ سنن ابو داؤد ہی کی روایت کے مطابق ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے زنا کا اقرار کیا اور جب ان کو زنا کی حد میں رجم کیا جانے لگا تو وہ بھاگ گئے ہیں۔ اس پر صحابہ نے پیچھا کر کے ان کو پتھر مارے اور انہیں رجم کر دیا۔ جب آپ ﷺ کے سامنے ان کے بھاگنے کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تم نے ماعز کو چھوڑ کیوں نہ دیا؟ تو رسول اللہ ﷺ جیسی نرم دلی کا اگر کچھ حصہ بھی ہم اپنے اندر پیدا کر لیں تو ہمیں اس دین کو لوگوں کے حلق میں انڈیلنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی بلکہ وہ اسے دل و جان سے قبول کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ آپ ﷺ اللہ کی رحمت کے سبب سے صحابہ کے حق میں بہت نرم ہیں اور اگر آپ سخت دل اور تند خو ہوتے تو لوگ آپ کے ارد گرد سے چھٹ جاتے۔ تو یہی نرمی ہے جو انسانوں کو داعی سے جوڑ کر رکھتی ہے اور داعی سے اس تعلق کی بنیاد پر وہ دین پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالی نرم ہے اور ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں۔ اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ جس سے نرمی چھین لی گئی اس میں کوئی خیر باقی نہیں ہے۔

جس عالم دین نے سوسائٹی میں نکل کر کبھی دو چار لوگوں کو دین کی دعوت نہ دی ہو، وہ میری یہ تحریریں کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہاں، تبلیغ والوں کو یہ باتیں اپنے دل کی باتیں محسوس ہوں گی جنہوں

نے لوگوں کی اصلاح کے لیے ان کے پیچھے دھکے کھائے ہوں۔ بھئی، آپ سوسائٹی میں نکل کر کوئی دعوت کا کام تو کریں، آپ کو ان باتوں کی قدر محسوس ہو۔ آپ کی صورت حال جب یہ ہو کہ مسجد سے نکلیں تو دس بارہ طالب علم آگے پیچھے ہوں، کلاس میں داخل ہوں تو پانچ سات آگے پیچھے ہوں تو کیسے یہ باتیں سمجھ میں آئیں گی، کبھی نہیں آئیں گی۔ پھر دینداروں میں دعوت اور تبلیغ بھی کوئی دعوت تبلیغ ہے، بے دینوں میں جا کر کام کریں تو معلوم ہو کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔

جنید جمشید نے میوزک کو خیر آباد کہا تو ایک چینل پر انٹرویو دے رہے تھے کہ انٹرویو لینے والے نے پوچھا کہ میوزک کو آپ نے خیر آباد کہا، وہی آپ کا ذریعہ آمدن تھا، آپ کے بقول حالات ایسے ہو گئے کہ جیب میں سو روپیہ بھی نہیں ہوتا تھا تو میوزک کے بارے آپ کی رائے کیا ہے؟ کیا یہ حرام ہے؟ تو جنید جمشید نے کہا کہ اس سوسائٹی میں یہ جملہ سننے کی سکت نہیں رہی ہے کہ میوزک حرام ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنید جمشید میوزک کو حرام نہیں سمجھتے تھے، جس معاشرے میں جا کر وہ لوگوں کی اصلاح کا کام کرتے تھے، وہاں یہ جملہ بولنا اپنی بات کو ضائع کر دینے کے مترادف تھا۔ انہوں نے خود میوزک چھوڑ دیا، ان کی وجہ سے سینکڑوں نے میوزک چھوڑا لیکن جو مفتی صاحب ان کی اس بات کو پکڑ کر فتوی لگائیں گے، ان کا سوسائٹی اور نوجوان نسل کی اصلاح میں کیا کام ہے؟ یہ سمجھنے کی بات ہے۔ غامدی صاحب اور ہم میں فرق کیا ہے، اس پر میں تفصیل سے آگے لکھوں گا لیکن یہاں ایک جملہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ہماری نرمی سے لوگ دین کی طرف راغب ہوتے ہیں، اور ان کی نرمی کی وجہ سے دین سے دور ہیں۔

اور آپ کے فقہاء کے شذوذات کیا ہیں؟ ان شذوذات سے وہ تو غامدی نہیں بنے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ اگر یہ کہتے ہیں کہ موسیقی جائز ہے تو وہ پھر بھی رحمہ اللہ ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ اگر یہ کہتے ہیں کہ مشت زنی جائز ہے، تو وہ پھر بھی رحمہ اللہ ہیں۔ حنفی اگر یہ فتوی دیتے ہیں کہ لڑکی گھر سے بھاگ کر نکاح کر لے تو جائز ہے تو انہیں تو کوئی غامدی نہیں کہتا کہ یہی فتوی غامدی صاحب بھی دیتے ہیں۔ شوافع اگر یہ کہتے ہیں کہ مشت سے کم داڑھی کاٹنا بھی جائز ہے تو انہیں بھی کوئی غامدی نہیں کہتا حالانکہ یہ فتوی غامدی صاحب کے فتوی کے قریب ہے۔ اگر اہل حدیث یہ کہتے ہیں کہ تصوف

متوازی دین ہے اور یہی بات غامدی صاحب بھی کہتے ہیں تو کوئی اہل حدیثوں کو تو یہ نہیں کہتا کہ تم غامدی ہو۔ تو کیا بچگانہ بات ہے کہ اگر حافظ زبیر صاحب کی کوئی رائے ایسی ہے جو اتفاق سے غامدی صاحب کی بھی ہے تو حافظ زبیر صاحب اب غامدی ہو گئے ہیں!

تو بھئی غامدی آپ کے سر پر کیوں اتنا سوار ہے کہ آپ کے خیال میں اس کی مخالفت ہی اصل دین ہے۔ تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ غامدی صاحب پانچ نمازوں کے بھی قائل ہیں۔ اگر آپ پانچ نمازوں کو مانتے ہیں تو آپ تو غامدی بن گئے۔ آپ لوگوں نے کیا تماشا لگا رکھا ہے! ہم نے جب غامدی صاحب کے بیانیے پر نقد کی تھی تو اس نقد میں بھی اسلوب بیان یہی رکھا تھا کہ ان کی یہ بات غلط ہے اور یہ درست ہے اور اس سے ہمیں اتفاق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود غامدی صاحب کے داماد نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ ہم نے آپ کی نقد کی فوٹو کاپیاں کروا کے اپنے حلقے میں بانٹی ہیں۔ تو یہ ہماری نقد کا اثر ہے، آپ کا اثر کیا ہے کہ جس پر آپ نقد کرتے ہو، آپ اسے گالیاں دو اور وہ آپ کو دے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب پر ہم نے نقد لکھی تو ان کے قریبی علماء نے سراہا جیسا کہ مولانا ذکوان ندوی صاحب نے۔ تو جس پر ہم نے نقد کی، اس نے تو اپنے مخالفین کو کہا کہ مجھ پر نقد پڑھنی ہے تو حافظ زبیر کی پڑھ لو۔ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں۔ تو ہمیں بھی تو یہ موقع دو کہ ہم بھی کسی کو کہہ سکیں کہ بھئی ہم پر اگر کسی کی نقد پڑھنی ہو تو فلاں کی پڑھ لو۔ غامدی غامدی کہنے سے کیا ہو گا، یا سر سید سے متاثر ہونے کے طعنے دینے سے کیا فرق پڑے گا۔ جہاں دلیل نہیں سوجھتی وہاں غصہ بڑھ جاتا ہے۔ پس غصہ نہ کریں بلکہ غور و فکر کر کے علمی جواب دیں، میں آپ کی نقد اپنی کتاب میں شائع کروں گا یا اس کا حوالہ دوں۔

مجھے ایک مرتبہ کلاس میں ایک شیعہ بچے نے سوال پوچھ لیا کہ آپ کی شلوار ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر کیوں ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ یہ سنت رسول ﷺ ہے۔ آج فیشن کی وجہ سے لڑکیاں اپنے ٹخنے ننگے رکھتی ہیں تو میں اگر کسی چیز کو سنت سمجھ کر رہا ہوں تو کیا حرج ہے؟ وہ کلاس میں کھڑا ہوا، اپنی پینٹ ٹخنوں سے اوپر کی اور کلاس کو گواہ بنا کر کہا کہ اب یہ نیچے نہیں جائے گی۔ تو یہ رویہ محض وعظ سے نہیں بلکہ استاذ اور شاگرد کے مجموعی تعلق سے پیدا ہوتا ہے، یہ سمجھنے کی بات ہے۔ تو ایک تو

لوگوں کودین کی طرف لانے اور راغب کرنے کے لیے نرمی کی ضرورت ہے۔ ہم نرمی دین سے دور کرنے کے لیے نہیں کرر ہے بلکہ دین پر لانے کے لیے کر رہے ہیں۔ اور دین سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کرر ہے ہیں۔ لوگ دین سے متنفر نہ ہوں تو یہ بھی تو دین سے تعلق پیدا کرنا ہی تو ہے۔ اور دین میں سختی لوگوں کو دین سے متنفر کر دیتی ہے۔ البتہ اپنے دین کے معاملے میں ضرور اپنے پر سختی کریں، کس نے منع کیا ہے۔

حنفی اور حنبلی علماء کا فتویٰ یہی ہے کہ عورت اپنے محرم کے بغیر حج اور عمرہ نہیں کر سکتی لیکن مجھ سے جب کوئی خاتون سوال پوچھتی ہیں کہ وہ بوڑھی ہیں اور پچاس سے اوپر کی عمر میں ہیں اور محرم کا بندوبست نہیں ہو رہا تو میں انہیں یہی کہتا ہوں کہ اگر تین سے پانچ عورتوں کا گروپ جا رہا ہے تو ان کے ساتھ جانے میں حرج نہیں ہے۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمارے ہاں لوگوں کو مکے اور مدینے سے کتنی عقیدت ہے۔ خدا کے گھر کو دیکھنا ان کے لیے جنت کو دیکھنے سے کم نعمت نہیں ہے۔ وہ ساری عمر ان لمحات کے انتظار میں رہتے ہیں اور پائی پائی جمع کرتے ہیں لیکن مفتی صاحب یہ کہہ کر کہ محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں ہے لہذا آپ نہیں جا سکتے، انہیں کس قدر ناامیدی اور مایوسی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسے ایک مفتی کی بجائے داعی کی نظر سے بھی دیکھیں کہ اس عمر میں حج اور عمرہ محض ایک فرض کی ادائیگی نہیں ہوتی بلکہ پوری زندگی کو تبدیل کر دینے والا واقعہ اور حادثہ (incident) ہوتا ہے۔

صحیح ہے کہ روایات میں محرم کے بغیر سفر سے منع کیا گیا ہے لیکن صحیح بخاری کی روایت میں یہ بھی تو ہے کہ ایک عورت صنعاء سے مکہ کا اکیلے سفر کرے گی اور اسے خدا کے علاوہ کسی کا ڈر اور خوف نہ ہوگا۔ تو اگر رستے پر امن ہیں اور عورتوں کی جماعت موجود ہے تو کوئی بوڑھی خاتون ان کے ساتھ جا کر حج اور عمرہ کی خواہش پوری کر لیں تو کیا حرج ہے؟ اگر فقہاء میں سے حنفیہ اور حنابلہ نے اس سے منع کیا ہے تو شوافع اور مالکیہ نے بھی تو اجازت دی ہے۔ لیکن ہم فقہاء کے اقوال میں سے آسانی کے انتخاب (pick and choose) کی بات نہیں کر رہے، ہم تو روایت سے جڑنے کی بات کر رہے ہیں۔ روایت سے جڑ جائیں تو دین کی آسانیاں اور سہولتیں از خود حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور روایت سے

براہ راست جڑنے کے بعد اگر فقہاء کی ایک جماعت کے اقوال بھی آپ کے حق میں ہوں تو اب آپ کو اور کیا چاہیے ! تو ہماری سختی نے صرف حرام امور کی فہرستوں میں اضافہ نہیں کیا بلکہ نیکی کرنے کے دروازے بھی بند کیے ہیں جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہو رہا ہے۔

اب دینی گھرانوں کی شادیوں میں اتنا گانے کی اجازت بھی کہاں ہے جتنی کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی عورتوں کو دی تھی؟ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انصار کی ایک دولہن تیار کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس لہو و لعب یعنی کھیل تماشے کا کچھ سامان ہے کہ انصار کو لہو و لعب پسند ہے۔ اور سنن ابن ماجہ کی روایت میں لہو و لعب کی شرح یوں بیان ہوئی ہے کہ کوئی بچی یہ گانا گائے کہ ہم تمہارے گھر آئے، ہم تمہارے گھر آئے.. تمہاری عمر بھی لمبی ہو، ہماری عمر بھی لمبی ہو۔

سنن ترمذی کی روایت میں یہی ہے کہ حلال اور حرام کے مابین فرق دف اور آواز کا ہے یعنی شادی والا گھر شادی والا گھر معلوم ہونا چاہیے، کوئی لائٹنگ کر لیں، دف بجا لیں، بچیاں جمع ہو کر اپنے ہاتھوں پر مہندی لگا لیں، دولہا دولہن کی تعریف میں کچھ گیت گا لیں۔ اب ہر جگہ ہم نے اس احتیاط کے نام پر دین کو مشکل بنا رکھا ہے کہ اگر لوگوں کو اتنے کی اجازت دے دی تو اتنی وہ خود نکال لیں گے۔ تو بھئی لوگوں میں شعور پیدا کریں۔ علم تو نام ہی خیر اور شر میں تمیز کا ہے۔ اب تمیز پیدا کرنے میں محنت لگتی ہے لہذا آپ کو آسان لگتا ہے کہ سب ہی کو شر بنا دیں تو یہ تو درست رویہ نہیں ہے۔ آپ کہیں کہ شادی بیاہ کے موقع پر میوزک اور ڈانس پارٹی درست نہیں ہے لیکن اب صرف یہ کہنے سے تبدیلی نہیں آئے گی جب تک یہ نہ کہیں گے کہ دف بجانے اور بچیوں کے کچھ گا لینے میں حرج نہیں ہے۔ بھلے خود سے نہ کریں، خود سے آدم بیزار بن جائیں، جنگلوں میں نکل جائیں، پہاڑوں پر چڑھ جائیں، سخت سے سخت فتاوی پر عمل کرنے کی کوشش کریں، جو مرضی کریں لیکن لوگوں کے لیے رخصتیں ضرور بیان کریں کہ یہ ان کا حق ہے کہ ہم ان سے اللہ کے دین میں نازل شدہ آسانیاں نہ چھپائیں۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ اسلام کیا ہے؟ تو

آپ نے جواب میں کہا کہ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کا اہتمام کرو۔ تو وہ شخص آپ کی یہ بات سن کر مجلس سے یہ کہتے ہوئے اٹھا ہے کہ اللہ کی قسم! اس میں نہ تو کمی کروں گا اور نہ اس سے زیادہ کروں گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی نے جنتی دیکھنا ہو تو اس شخص کو دیکھ لے۔ تو ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ارکان اسلام کے علاوہ کوئی نیکی نہیں کرنی ہے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف اشخاص کو ان کے حالات کے مطابق انہیں کم سے کم دین تجویز کیا ہے کہ لوگوں کو دس فی صد دین پر لانا بھی کوئی کام ہے، یہ آج ہمارے علماء اور داعیان دین کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سنن ترمذی کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے آکر کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ دین اسلام کے احکامات بہت زیادہ ہیں، مجھے تو آپ کوئی ایک چیز تجویز کر دیں کہ جسے میں اچھی طرح پکڑ لوں یعنی اس کا میں اہتمام کر لوں گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پھر اپنی زبان کو ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رکھنا ہے۔ تو یہ رسول اللہ ﷺ کا دعوت اور اصلاح کا منہج ہے۔ آج ہم سے اگر کوئی آکر ایسا سوال کرے گا تو ہم تو اسے سوال سنتے ہی یوں نہ کہیں گے کہ کیا کافر بننا چاہتے ہو جو دین کے صرف ایک حکم پر عمل کی بات کر رہے ہو؟

اس وقت مجھے وہ حکایت یاد آرہی ہے کہ ایک مفتی صاحب سے کسی شخص نے پوچھا کہ میں بغیر وضو کے نماز پڑھ لیتا ہوں کیونکہ مجھ سے بار بار وضو نہیں ہوتا ہے تو کیا میری نماز ہو جاتی ہے؟ تو مفتی صاحب نے کہا کہ نماز ہونا تو دور کی بات اس طرح پڑھنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ یہی سوال اس نے کسی صوفی سے آکر پوچھ لیا تو اس نے کہا کہ پڑھتے رہو۔ صوفی کے مریدوں میں سے کسی نے کہا کہ کیا نماز ہو جاتی ہے جو آپ نے اسے یہ کہا ہے؟ صوفی نے جواب دیا کہ نماز تو نہیں ہوتی لیکن مجھے اللہ سے امید ہے کہ اللہ اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے وضو کی بھی توفیق دے دے گا لہذا میں نے اسے اس سے روکا نہیں ہے۔ یہ حکمت آج ہمیں اپنی دعوت اور تبلیغ میں ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب متشدد مذہبی ذہن اس حکایت میں موجود حکمت پر تو کچھ توجہ نہ کرے گا لیکن فوراً اس پر ایک نقد شائع کر دے گا کہ دیکھو حافظ زبیر صوفیوں سے رہنمائی لینے کا قائل ہو گیا ہے یا بغیر وضو کے نماز پڑھنے کا فتوی دے رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب نہ تو ہمارا مقصد بغیر وضو کے نماز پڑھنے کا فتوی

جاری کرنا ہے اور نہ ہی ہم یہاں علماء کی بجائے صوفیاء سے فتوے لینے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ ہمارا مقصود صرف اتنا ہے کہ علماء کو ہر چیز کو صرف علمی نقطہ نظر سے ہی نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ فتوی دیتے وقت اخلاقی، معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ہمارے علماء اور مفتیان کرام معاشرے کی اصلاح میں اس پہلو کو بھی مد نظر نہیں رکھتے کہ امر شرعی اور امر واقعی میں بعض اوقات اتنا بڑا خلاء موجود ہوتا ہے کہ صرف شرعی حکم کے بیان سے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ اس رویے پر اصرار سے وہ خلاء مزید بڑھ نہ جائے۔ مثال کے طور پر یونیورسٹی میں اگر بے حیائی اور فحاشی بڑھ گئی ہے تو اس کی وجہ مخلوط تعلیم (co-education) ہے لہذا مخلوط تعلیم ہی نہیں ہونی چاہیے۔ بھئی تمہارا یہ فتوی صحیح ہونے کے باوجود بے کار ہے کہ مخلوط تعلیم ایک حقیقت ہے، وہ جاری رہے گی۔ باقی میں بھی یہ کہتا ہوں کہ نہیں ہونی چاہیے لیکن "نہیں ہونی چاہیے" کے فتوی سے مسئلہ حل نہیں ہوا، وہ اپنی جگہ موجود ہے۔

ہندوستان کے ایک بڑے عالم دین سے کسی نے پوچھا کہ ہندوستانی روپیہ پر گاندھی جی کی تصویر ہے لہذا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس روپے کو استعمال کرے؟ یعنی ایک تو تصویر جیسی حرام شیء اور دوسری وہ بھی گاندھی جی جیسے ہندو لیڈر کی! تو انہوں نے جواب میں کہا کہ میں فتوی تو دے دوں گا لیکن فتوی نہیں چلے البتہ روپیہ چل جائے گا۔ آج اگر کوئی مفتی صاحب یہ فتوی دے دیں کہ نماز پڑھنے سے پہلے نمازی حضرات اپنی جیبوں سے نوٹ نکال کر باہر رکھ دیا کریں کہ ان نوٹوں پر قائد اعظم کی تصویر ہے اور تصویر اسلام میں حرام ہے تو دل سے بتلائیں کہ کیا ایسے فتوے سوسائٹی میں دین کی تقویت کا باعث بنیں گے یا مذاق بن کر رہ جائیں گے؟

ہماری رائے میں ایسے فتاوی افراد اور معاشرے دونوں کو دین سے لاتعلق کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کرتے ہیں کہ یہ حکمت سے خالی ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ ایسا ایسا موقف نہ رکھیں کہ یہ آپ کا علمی حق ہے کہ آپ دلیل کی بنیاد پر جو بھی موقف رکھیں لیکن ہمارا کہنا صرف اتنا ہے کہ جس زمانے میں آپ بیٹھے ہیں، اس زمانے میں اگر آپ کا موقف ایسا ایسا ہے تو اسے پیش کرنے (presentation) کا ایسا ڈھنگ بھی آپ کو سیکھنا چاہیے کہ آپ دین کو ایک مذاق کی

بجائے قابل عمل نظام کے طور پیش کر پائیں۔

مخلوط تعلیم کے جس ماحول میں 80 فی صد طلباء اور طالبات یونیورسٹی کے باغیچوں میں چھپ چھپ کر راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوں، وہاں آپ چہرے کا پردہ کرنے کی بات کریں گے تو گناہ اور بڑھ جائے گا کہ پردے میں گناہ میں آسانی رہتی ہے لہذا اس ماحول میں اصل توجہ (focus) زنا سے ممانعت کو دینی چاہیے۔ اب جب یونیورسٹی میں پڑھنے یا پڑھانے والا طالب علم یا استاذ وہاں کچھ دعوت کا کام کرنا چاہتا ہے تو وہ بڑے بڑے منکرات سے لوگوں کو روکتا ہے اور چھوٹے منکرات کی طرف توجہ نہیں دیتا لیکن یونیورسٹی کے ماحول سے باہر بیٹھے مفتی صاحب کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر چھوٹے منکرات سے روکنے کا ماحول نہیں ہے یا ایسا کرنے سے مخاطب پر کوئی اثر نہیں ہو گا تو پھر کیا آپ نہی عن المنکر ہی چھوڑ دیں؟

پھر یونیورسٹی یونیورسٹی میں فرق ہوتا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ ڈیپارٹمنٹ کا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ اسلامی یونیورسٹی میں طالبات کو حجاب اور پردے کا نہیں کہیں گے تو پھر کہاں کہیں گے؟ اسی طرح اگر کسی سرکاری یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے اساتذہ علوم اسلامیہ میں تخصص کرنے والی طالبات کو پردے کی ترغیب نہ دیں گے تو پھر کسے دیں گے؟ لیکن اگر آپ کسی پرائیویٹ یا ماڈرن یونیورسٹی میں فائن آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ میں چہرے کے پردے کی بحث چھیڑ دیں گے تو آپ اور آپ کا دین دونوں مذاق بن جائیں گے۔ گندگی کے ڈھیر پر بیٹھنے والے کو آپ یہ توجہ نہیں دلائیں گے کہ بھئی آپ کی قمیض پر نیلی سیاہی کا ایک نقطہ لگا ہوا ہے، اسے کسی اچھے سرف سے دھو لیں۔ آپ اسے اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ گندگی کے ڈھیر پر بیٹھا ہے جو کہ اسے نہیں بیٹھنا چاہیے۔

تو بھئی کس نے کہا ہے کہ آپ نہی عن المنکر چھوڑ دیں۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے نہی عن المنکر کرنے سے اگر کوئی بڑا منکر پیدا ہو رہا ہو تو پھر یہ نہی عن المنکر چھوڑ دیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا گزر تاتاریوں کے ایک ایسے گروہ سے ہوا کہ جو اسلام قبول کر چکا تھا اور شراب کے نشے میں غرق تھا۔ آپ کے شاگردوں میں سے بعض نے انہیں نہی عن المنکر کرنا چاہا تو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

نے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں۔ ان وحشیوں کو نشے میں مست رہنے دو۔ اگر یہ ہوش میں آئیں گے تو مسلمانوں کی بستیاں اجاڑ دیں گے۔ تو یہ اس وقت جس منکر میں ہیں، وہ چھوٹا منکر ہے۔ اس منکر سے ان کو نکال لو گے تو یہ لازماً ایک بڑے منکر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ تو ایک اس اصول کا بھی خیال رکھنا ہے کہ نہی عن المنکر سے کسی درجے میں منکر کا ازالہ ہو رہا ہو اور اس کے نتیجے میں کوئی اور منکر یا بڑا منکر پیدا نہ ہو رہا ہو تو تبھی یہ سود مند ہے۔

یہاں اس پر بھی غور کر لیں کہ ہمارے فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ظالم حکمران کے خلاف مسلح بغاوت جائز نہیں ہے اور اس کی دلیل بھی یہی ہے کہ کہیں ظالم حکمران کا ظلم ختم کرتے کرتے تم پورے ملک کو ہی کسی ظلم میں مبتلا نہ کر دو۔ شام، یمن اور لیبیا میں ظالم حکمرانوں کے خلاف خانہ جنگی (civil war) کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ تینوں ممالک میں تین تین حکومتیں بن چکی ہیں جو آپس میں ہی لڑ رہی ہیں، شہر ویران ہو چکے، گھر ملبے کا ڈھیر بن گئے، لاکھوں مسلمانوں کی شہادتیں ہوئیں، لاکھوں بے گھر ہوئے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا قتل عام ہوا، شعراء نے ہماری حالت زار پر مرثیے کہے، فنکاروں نے اپنے شہ پاروں میں ہمارے درد کو سمونے کی کوششیں کیں لیکن کیا ہوا، کچھ بھی نہیں، پچھلے پانچ سات سالوں سے حالات بد سے بدتر ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ہم نے سختی کی انتہاء بھی دیکھ لی اور اس کے نتائج بھی، معلوم نہیں اب بھی ہمارا دین کو سخت بنانے یا دین کے نام پر سختی کرنے کا شوق ختم کیوں نہیں ہو رہا! [1]

اب تو یہاں عجیب ماحول ہے کہ جو جس قدر سختی اختیار کرے، وہ اتنا بڑا امام بن جاتا ہے حالانکہ اللہ عزوجل نے موسی علیہ السلام کو فرعون کے لیے کہا تھا: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ

---

[1] پھر دین میں سخت رویہ اختیار کرنے سے اخلاقی کرپشن بھی بڑھ جاتی ہے، اگر یقین نہ آئے تو سخت فتوے دینے والوں کی چار ماہ کی سرچ ہسٹری نکال لیں۔ پہلے تو وہ صرف خدا کے پاس تھی، اب تو گوگل اور فیس بک والوں کے پاس بھی ہے۔ بھئی یہ گوگل، فیس بک والے جھوٹ بکتے ہوں گے لیکن جب ہمارے دائیں بائیں ہمارے ذاتی مشاہدے میں ایسے کردار موجود ہیں تو ہم ان کا کیا کریں۔ مزید اگر ایسی۔ مذہبی شخصیات کی پیدائش کے اسباب وعوامل کا منطقی، نفسیاتی، مذہبی اور معاشرتی سطح پر مطالعہ کرنا ہو تو اناطول فرانس کا نوبل انعام یافتہ ناول "تائیس" پڑھ لیں کہ پفتونوس راہب جیسے کردار صرف دین عیسائیت میں نہیں تھے بلکہ ہر مذہب میں موجود ہیں۔ اور یہ میں آپ بھی ہو سکتے ہیں، ہمیں اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ بس اس پیراگراف میں اتنا کہنا ہی مقصود کلام تھا۔

یَخْشَیٰ﴾ کہ اس سے نرم بات کرنا، شاید اس نرمی کی وجہ سے وہ کوئی نصیحت پکڑ لے۔ تو یہ سارے مسلمان معاشرے کیا فرعون سے بھی گئے گزرے ہیں؟ یہ منہاج کی نرمی ہے۔ اصول فقہ میں بھی مصلحت مرسلہ (public interest)، سد الذرائع (blockage of means)، استحسان (equitable remedy) اور عرف (custom) کے اصول دراصل منہاج کے اصول ہیں۔ کبھی اس نظر سے بھی اصول فقہ کا مطالعہ کر لیں۔

صحیح روایت کے مطابق ایک بدو نے مسجد نبوی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ اس کو مارنے کے دوڑے تو آپ نے ان اٹھنے والوں سے کہا کہ اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بہا دو اور اسے اپنے پاس بلایا اور سمجھایا کہ مسجد میں یہ کام نہیں کرنا اور وہ زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کا ممنون رہا۔ اور وہ تو مسجد نبوی تھی، یہاں عام مسجد میں کوئی اس سے دس گنا کم حرکت تو کر کے دیکھے، نمازی اس کا بھرکس نہ نکال دیں۔ اور تو اور آپ مسجد میں اپنے بچے ہی لے آئیں تو نمازیوں کا رد عمل دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ہم ہر چیز کو مفتی کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں حالانکہ کسی عمل کی شرعی حیثیت کو جانچتے وقت ہماری دائیں آنکھ داعی کی ہونی چاہیے نہ کہ مفتی کی اور بائیں آنکھ بھلے مفتی کی ہی رکھ لیں۔ ہمیں یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ صرف مفتی کی آنکھ سے دیکھنے سے دین کی کل تصویر سامنے نہیں آئے گی کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ہمیں داعی، مفتی سے زیادہ غالب نظر آتا ہے لہذا اپنی شخصیت میں داعی کی نظر کو غالب رکھیں اگر تو واقعی میں معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں۔ سختی جب مزاج کا حصہ بن جاتی ہے تو دوسرے مسلک تک محدود نہیں رہتی بلکہ ہم اپنے مسلک کے لوگوں کا بھی اس شدت اور سختی سے رد کر رہے ہوتے ہیں کہ جیسے کوئی جہاد فرما رہے ہوں۔ ہر مسلک کی ذیلی سیاسی جماعتوں اور مذہبی تنظیموں کی باہمی چپقلش کی داستان کا مطالعہ یہاں فیس بک پر ہی فرما لیں تو کافی ہے۔

میں رفع الیدین کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں اور یہی بات درست سمجھتا ہوں کہ رفع الیدین کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی حنفی مسجد میں امام مسجد موجود نہیں ہے، بعض نمازیوں نے مجھے نماز کے لیے آگے کر دیا تو اب میں نے ان کا لحاظ کیا اور حنفی طریقے سے نماز پڑھا

دی۔ یہ منہاج کی نرمی ہے۔ اب اہل حدیثوں کے بولنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

بہر حال غالباً 1999ء کی بات ہے کہ میری اس عادت کا علم ہمارے بعض اہل حدیث بھائیوں کو ہوا تو مقامی اہل حدیث مسجد کے خطیب صاحب نے مجھ پر جمعہ لگا دیا کہ حافظ زبیر بدعتی ہو گیا ہے۔ خیر میں تو جمعہ میں نہیں تھا لیکن بڑے بھائی صاحب اس جمعہ میں موجود تھے اور وہ دیوبندی ہیں تو انہوں نے مجھے کہا کہ میں تو اتفاق سے اہل حدیث کی مسجد میں جمعہ پڑھنے گیا تھا اور وہاں خطیب صاحب تمہارے فضائل بیان فرما رہے تھے، تم کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہو؟ آئندہ تم نے وہاں جمعہ پڑھنے نہیں جانا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آئندہ بھی وہاں جمعہ پڑھنے جایا کروں گا، مجھے ان کے موقف سے اتفاق ہوا ہے، اخلاق اور رویوں سے نہیں۔ بعد میں اسی مسجد میں اہل حدیث نمازیوں کے مابین لڑائی ہوئی، بعد میں ایک مسجد سے دو مسجدیں بن گئیں۔ مجھے اللہ عزوجل نے ان لوگوں میں صلح کروانے کی توفیق عطا فرمائی جو میرے پیچھے نماز نہ ہونے یا میرے بدعتی ہونے کے فتوے دیا کرتے تھے۔ اب بھی اس مسجد میں نماز پڑھنے جاتا ہوں تو لوگ آگے کرنا بھی چاہیں تو آگے نہیں ہوتا لیکن ان کے پیچھے نماز ضرور پڑھ لیتا ہوں۔ اور کبھی کچھ دوست زیادہ اصرار کر کے آگے کھڑا بھی کر دیتے ہیں کہ باقی مسالک کی طرح اہل حدیث میں بھی سب ہی متشدد نہیں ہیں بلکہ ایک بڑی تعداد معتدل حضرات کی بھی ہے۔

اور یہ بھی میرے ساتھ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے دیکھ کر اہل حدیث ہو جاتے ہیں حالانکہ میں اختلافی مسائل پر بالکل بھی جمعوں، خطبات اور دروس میں گفتگو نہیں کرتا۔ ایک نمازی جو دو سال سے میرے پیچھے جمعہ پڑھ رہے تھے، میرے پاس آئے اور مجھے کہنے لگے کہ مجھے رفع الیدین کرنے کا طریقہ سکھا دیں۔ میں نے کہا کہ خیریت ہے؟ کہنے لگے کہ آپ نماز میں رفع الیدین کرتے ہیں، میں نے بھی کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا مسلک کیا ہے؟ کہنے لگے، مسلک جو بھی ہے، نماز میں نے ویسے پڑھنی ہے جیسے آپ پڑھتے ہیں۔ ایک اور نمازی نے ایک مرتبہ بتلایا کہ میں عرصہ سے آپ کے پیچھے جمعہ پڑھ رہا ہوں، آپ سے تعلق پیدا ہوا لہذا میں نے خود بھی اور اپنے گھر میں ویسے ہی نماز پڑھنی شروع کر دی جیسے آپ پڑھتے ہیں۔ اور میں نے خود ہی انٹرنیٹ پر ریسرچ کی تھی کہ ایسے نماز

کون پڑھتا ہوں تو مجھے معلوم ہوا کہ اہل حدیث پڑھتے ہیں، اب میں اور میرا پورا گھرانہ اہل حدیث ہیں حالانکہ اس نے میری زبان سے شاید چار سالوں میں اہل حدیث کا لفظ بھی نہ سنا ہو گا۔ اب حنفیوں کے بولنے کی باری ہے۔

سنن النسائی کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دین میں غلو سے بچو کہ تم سے پہلی قومیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ غلو آپ کے دین کو کس طرح تباہ کرتا ہے، اس کا اندازہ بعض معاصر جہادی تحریکوں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ ابھی دو چار دن پہلے ہی صومالیہ میں القاعدہ کی جہادی شاخ "الشباب" نے ایک طرف ایک خاتون پر رجم کی حد جاری فرمائی کہ ان کے بقول اس خاتون نے نو مردوں سے شادی کی تھی اور کسی سے بھی طلاق نہ لی تھی اور دوسری طرف ان مجاہدین کی اپنی صورت حال یہ ہے کہ عیسائی اور مسلمان عورتیں لونڈیاں بنا کر رکھی ہیں اور ایک عورت کے ساتھ ایک ہی رات میں تین تین مجاہد مستفید ہوتے ہیں کہ وہ ان کی اجتماعی لونڈی ہے۔

دین میں سختی سے بدترین اخلاقی کرپشن جنم لیتی ہے۔ عجب لوگ ہیں کہ اب دین میں اسی سختی کی بنیاد پر دین کی امامت پر سرفراز کرتے ہیں۔ آپ سخت سے سخت فتوے دینا شروع کر دیں، لوگ آپ کو امام کہنا شروع کر دیں گے حالانکہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ متشدد دین ہلاک ہو جائیں۔ اور اس روایت سے مراد دین میں تشدد کرنے والے لوگ ہیں۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ اللہ عزوجل نے بنی اسرائیل کی ایک فاحشہ عورت کو کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے نہ صرف بخش دیا بلکہ جنت میں داخل کر دیا کہ اس کے پانی پلانے سے اس کتے کی جان بچ گئی تھی۔ اور صحیح بخاری ہی کی روایت ہے کہ اللہ عزوجل نے ایک عورت کو بلی کو باندھ رکھنے کی وجہ سے جہنم میں ڈال دیا کہ اس باندھ رکھنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ تو ایک عورت دل کی نرمی کی وجہ سے جنت میں جا رہی ہے اور دوسری دل کی سختی کی وجہ سے جہنم میں جا رہی ہے ورنہ کتے کو پانی پلانا بھی کوئی اتنی بڑی نیکی ہے کہ بندہ جنتی ہی بن جائے اور بلی کو باندھ کر رکھنا بھی کوئی اتنا بڑا گناہ ہے کہ بندہ جہنمی ہی بن جائے۔

اور دوسری اہم بحث یہ کہ جنت میں ہم اپنے اعمال کے بدلے نہیں بلکہ اللہ کی رحمت کی وجہ سے

جائیں گے کہ یہ اللہ عزوجل ہی ہے کہ جو کسی حقیر سی نیکی کو ہمارے جنت میں جانے کا سبب بنا دیں گے جبکہ ہماری بڑی بڑی نیکیاں شاید ریاکاری کا ٹیگ لگنے کی وجہ سے جہنم میں جانے کا سبب بن رہی ہوں گے۔ مسند احمد کی صحیح روایت میں ہے کہ اللہ عزوجل نے ایک شخص کو صرف اس وجہ سے معاف کر کے جنت میں داخل کر دیا کہ اس نے مسلمانوں کے رستے میں پڑی ہوئی ایک کانٹے دار جھاڑی کو ہٹا کر رستہ صاف کر دیا تھا تا کہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ سب سے پہلے جن لوگوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو ان میں ایک مجاہد، ایک قاری قرآن اور ایک سخی ہو گا اور ان کے جہنم میں جانے کا سبب یہ ہو گا کہ مجاہد کے جہاد میں، قاری کی تلاوت میں اور سخی کے صدقے میں ریاکاری ہو گی۔ تو بھائی کون سے اعمال؟ کیسے اعمال؟ بس اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے، ہر وقت استغفار کی حالت میں رہیں، کسی چھوٹی نیکی کو حقیر نہ جانیں اور کسی بڑی نیکی پر فخر نہ کریں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہماری کون سی حقیر نیکی ہمارے جنت میں جانے کا سبب بن رہی ہے اور ہماری کون سی بڑی نیکی ہمیں جہنم میں لے جانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

جب قانونی بحثیں بڑھ جاتی ہیں تو دلوں میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا کہ تورات کی قانونی بحثوں میں اس قدر الجھے کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں کہا کہ ان کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ اور پھر حضرت عیسی علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور انجیل کو نازل کیا گیا تو نہ تو انجیل میں کوئی قانونی بحث ہے اور نہ ہی حضرت عیسی علیہ السلام نے مسئلے مسائل بتلانے پر زور دیا بلکہ اپنی دعوت کا اصل مرکز اصلاحِ قلوب (purification of the heart) اور اخلاق کو بنایا۔ پھر شیطان نے ہمیں عجب دھوکے میں ڈال رکھا ہے کہ ہم تو دین اور حق کے لیے سختی کرتے ہیں لہذا جائز ہے۔

سنن ابوداؤد میں روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں دو بھائی تھے، ایک گناہ گار تھا دوسرا بہت زیادہ عبادت گزار۔ عبادت گزار اپنے گناہ گار دوست کو کہتا تھا کہ گناہ سے رک جاؤ۔ ایک دن اس گناہ گار کو غصہ آ گیا اور اس نے کہا کہ کیا ہر وقت نصیحت میں لگے رہتے ہو، کیا تم مجھ پر ٹھیکیدار ہو؟ اس پر عبادت گزار نے کہا کہ اللہ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ جب دونوں اللہ عزوجل کے پاس پیش

ہوئے تو اللہ نے گناہ گار کے لیے حکم دیا کہ اسے میری رحمت کے بدلے جنت میں داخل کر دو اور عبادت گزار کے لیے کہا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ کہ یہ کون ہوتا ہے یہ کہنے والا کہ میں کسی گناہ گار کو معاف کروں گا یا نہیں؟ سنن ابن ماجہ کی ایک صحیح روایت میں ہے کہ بعض اوقات ایک شخص ایک ایسی اچھی بات اپنی زبان سے نکال جاتا ہے کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن تک کے لیے اس سے راضی ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات انسان اپنی زبان سے ایک ایسی بری بات نکال جاتا ہے کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن تک کے لیے اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اچھی بات سے مراد کوئی شکر کا کلمہ اور بری بات سے مراد کوئی ناشکری کی بات ہو سکتی ہے۔ تو کتنا چھوٹا سا عمل ہے جو اللہ کو راضی کرنے اور اللہ کی ناراضگی کا سبب اور باعث بن رہا ہے، بس ایک چھوٹی سی بات ہی تو ہے جو جنت میں لے جائے گی یا جہنم میں دھکیل دے گی۔

صحیح بخاری ہی کی روایت میں ہے کہ ایک شخص کو قیامت والے دن لایا جائے گا کہ جس کے گناہ کے ننانوے رجسٹر ہوں گے اور ہر رجسٹر تا حد نگاہ پھیلا ہو گا۔ اللہ عزوجل اس سے سوال کریں گے کہ اے میرے بندے، کیا کوئی نیکی بھی کر کے آیا ہے؟ تو وہ کہے گا کہ یاد نہیں ہے کہ میں نے کوئی نیکی کی ہو۔ تو اللہ عزوجل کہیں گے کہ ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی ہے۔ اور اس کی ایک نیکی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائے گی اور گناہ دوسرے میں تو گناہ والا پلڑا ہوا میں اڑنا شروع ہو جائے گا۔ تو اس نیکی کے بارے حدیث میں "كلمة الإخلاص" کے الفاظ ہیں یعنی اخلاص، دل کی آمادگی، اللہ کو خوش کرنے کے لیے اس نے کلمہ شہادت پڑھا ہو گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جہنم کی آگ سے بچو، چاہے ایک کھجور صدقہ کر کے ہی بچ جاؤ۔ تو اپنی کس عبادت اور دعوت تبلیغ پر میں تکیہ کروں؟ نہ معلوم کل یہی میرا نہی عن المنکر کا کام تھوڑی سی غلطی سے جہنم میں جانے کا ذریعے بن جائے۔ اور دوسروں کو میں گناہ گار ہونے کے باوجود کیسے کم تر سمجھوں کہ نہ معلوم کل ان کا محض ایک کھجور کا صدقہ کر دینا انہیں جنت میں لے جائے۔

بلکہ ایک حدیث میں تو دل دہلا دینے والا زوردار انداز ہے۔ صحیح روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فإنه لا يُدخِل أحدًا الجنةَ عملُه، قالوا: ولا أنت يا رسول الله؟ قال: ولا أنا، إلا

أن يَتغمدَني اللهُ بمغفرة ورحمة))۔ ترجمہ: تم میں کوئی بھی اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ صحابہ نے کہا کہ کیا آپ بھی؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، میں بھی یہاں تک کہ اللہ اپنی بخشش اور رحمت سے مجھے بھی ڈھانپ لے۔ تو یہ جنت آپ کے اور میرے اعمال کا بدلہ ہر گز نہیں ہے، یہ تو اللہ کی رحمت سے ملنی ہے۔ باقی اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں ہمارے اکرام کے لیے یہ ضرور کہا ہے کہ جنت تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے دی جا رہی ہے۔ تو یہ بات صرف زبان پر نہ ہو، دل میں آ جائے تو دل کی نرمی پیدا ہوتی ہے کہ جنت میرے تیرے کے اعمال کے بدلے نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سے ملے گی۔

باقی عمل کرنا ہے، کیوں نہیں کرنا، بھئی ضرور کرنا ہے کہ عمل جنت میں جانے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے جیسا کہ اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ آیت کریمہ ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [الزخرف: 72]۔ ترجمہ: [اور قیامت والے دن اہل جنت سے کہا جائے گا کہ] یہ وہ جنت ہے کہ جس کے تم اپنے اعمال کے سبب سے وارث بنائے گئے ہو، میں باءِ سبب کی ہے نہ کہ مقابلے یا بدل کی۔ تو ہمیں لوگوں کو عمل کی ترغیب اور تشویق بھی دلانی ہے لیکن حکمت اور فراست کے ساتھ۔ پس لوگوں کو سخت سے سخت مسئلے اس لیے نہ بتلائیں کہ جنت میں داخل ہونے کا دروازہ سختی کا دروازہ ہی ہے۔ یہ بھی اپنے دین کے بارے عجیب تاثر ہم نے عام کر دیا ہے کہ جیسے یہ کوئی پہاڑ جیسا بوجھ ہے کہ جسے اٹھانے کے بعد ہی کوئی شخص جنت میں داخل ہونے کا اہل قرار پاتا ہے۔ ایک شخص کا ایک مرتبہ مجھے فون آیا کہ ساری زندگی بینک کی نوکری کی، اسی سے گھر بھی بنایا اور اب آخر میں کچھ پیسے لے کر ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ مجھے ابھی معلوم یا احساس ہوا کہ بینک کی نوکری جائز نہیں ہے تو میں نے مفتیان کرام سے پوچھا ہے کہ میں کیا کروں؟ تو ان کا کہنا ہے کہ بینک کی نوکری جائز نہیں ہے لہذا اس کی کمائی بھی حلال کی نہیں ہے۔ تو آپ ساری جمع پونجی بغیر صدقہ کی نیت سے مساکین اور غرباء میں خرچ کر دیں۔ سائل نے پوچھا کہ گھر کا کیا کروں؟ تو مفتی صاحب نے کہا کہ اسے بھی نکال دو۔ سائل نے کہا کہ پھر تو سڑک پر آ جاؤں گا۔ تو مفتی صاحب نے کہا کہ آ جاؤ اور کوئی رستہ نہیں ہے۔ مجھ سے جب سائل نے پوچھا تو میں نے کہا کہ

قرآن مجید میں ایک آیت ہے کہ جب کوئی شخص سچی توبہ کر لیتا ہے تو اللہ عزوجل اس کے گناہ نیکیوں سے بدل دیتے ہیں تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جو تم نے جہالت یا نادانی میں کمایا ہے، اب وہ جائز ہے، آئندہ ایسے نہ کرنا۔ تو اگر حقوق العباد کا پیسہ ہے تو وہ تو واپس کر دو اور اگر حقوق اللہ میں کوتاہی ہوئی ہے تو توبہ سے معاف ہو گئی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ہی مجموع الفتاوی میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ بعض اوقات ایک شخص کی ساری زندگی یا زندگی کا ایک بڑا حصہ دین سے غفلت میں گزر جاتا ہے اور وہ حلال وحرام کی پرواہ نہیں کرتا لیکن آخر عمر میں اسے توبہ نصیب ہو جاتی ہے تو اب اسے ایسے فتوے نہ دو کہ یہ توبہ جسے اللہ عزوجل نے اس کے لیے رحمت قرار دیا ہے، اسے عذاب محسوس ہونے لگ جائے۔ تو یہ کتنی بڑی حکمت کی بات ہے لیکن اس کو کہنے کے لیے کسی مفتی کا نہیں بلکہ صوفی کا دل چاہیے کہ جس سے ہمارے آج کے اکثر مفتی صاحبان محروم ہیں۔

اب دین میں یہ آسانی اس سائل کو کہاں سے ہضم ہونے والی تھی کہ جس نے ساری زندگی خطیبوں سے خدا کا یہ تصور ہی سن رکھا ہو کہ ممتاز مفتی کے بقول جیسے وہ کوئی بھٹیارن ہو کہ جس کا کام صبح شام لوگوں کو بھٹی میں ڈالنا ہو۔ تو سائل نے مجھ سے کہا کہ یہ تو بہت آسان فتوی ہے، اس پر دل مطمئن نہیں ہو رہا۔ تو میں نے کہا کہ پھر دوسری تھوڑی مشکل صورت یہ ہے کہ جتنا پیسہ بینک سے ملا ہے مثلاً بیس لاکھ تو اسے قرض سمجھ کر اس سے کاروبار کر لیں۔ اب اس سے جو پیسہ یا نفع ملے تو اسے جائز سمجھ لیں اور جو اصل رقم ہے یعنی بیس لاکھ، اس کو بعد میں صدقہ کر دیں۔ تو اس پر سائل کا دل مطمئن ہو گیا۔ تو بعض اوقات مجھے کسی شخص کی نفسیات کی وجہ سے ذرا مشکل مسئلہ بھی بتلانا پڑ جاتا ہے حالانکہ میری نظر میں شریعت میں زیادہ آسانی ہوتی ہے لیکن چونکہ اس شخص کا اطمینان بھی مطلوب ہے لہذا اس کا بھی لحاظ کر لینا چاہیے۔

لوگوں کو دین پر لانے میں ان کی نفسیات اور ان کے احوال دو چیزوں کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ میرا بیٹا بارہ سال کا ہے۔ نماز پڑھتا ہے لیکن گھر میں ہی۔ دو دن پہلے میں نے اسے کہا کہ چلو مسجد چلتے ہیں تو کہنے لگا نہیں، آج نہیں، کل جاؤں گا۔ اب میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ میں خود چاہ رہا ہوں کہ پانچ سات مرتبہ وہ اور کہے کہ کل جاؤں گا تاکہ اس کی انکار کی جبلت جلد ہی تسکین پا جائے اور پھر

راحت نفس سے مسجد میں جائے گا نہ کہ یہ سمجھ کر کہ باپ کے جبر سے گیا ہوں۔ میں کل مسجد جاؤں گا اور میں نے مسجد جانا ہی نہیں، دونوں جملوں میں فرق ہے اور دونوں بچوں کی کیفیت بھی مختلف ہے اور علاج بھی مختلف۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کہا تھا کہ حطیم، خانہ کعبہ کا حصہ ہے اور میرا دل کرتا ہے کہ میں اسے خانہ کعبہ میں شامل کر لوں لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ اسے ذہناً قبول نہ کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی نفسیات کا لحاظ کیا ہے اور صرف اس وجہ سے خانہ کعبہ کو اس کی ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ کھڑا نہ کیا کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں لہذا اس تبدیلی کو قبول ہضم نہ کر پائیں گے کیونکہ وہ اپنے آباء واجداد کے زمانے سے خانہ کعبہ کو ایسے ہی دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ حطیم کا حصہ اس میں شامل نہیں ہے۔ یہ روایت بیان نہ ہوتی تو ناقدین یہ کہتے کہ اب ہم دین کو لوگوں کی نفسیات کے لیے بدل دیں؟ معلوم نہیں دین نہ ہوا کوئی زنجیریں اور بیڑیاں ہو گئیں کہ جنہیں پہن کر ساری زندگی قید میں گزارنی ہے۔

پھر یہ نہیں کہ اپنے خطبات میں نرمی ہی کی بات کریں بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہو تو دین کی سختی کا بھی تذکرہ ضرور کریں لیکن اپنی دعوت و تبلیغ میں غالب عنصر نرمی کا ہی رکھیں۔ یونیورسٹی کی کلاس میں جو باتیں میں نہیں کرتا، وہی یونیورسٹی کی مسجد میں جمعہ پڑھاتے ہوئے کر جاتا ہوں بلکہ بعض رفقاء تو مجھے یہاں تک کہتے ہیں کہ حافظ صاحب اتنا وعظ یونیورسٹی کے ماحول میں اچھا نہیں ہے اور لگتا ہے کہ اب آپ یہاں زیادہ دیر ٹکنا نہیں چاہتے۔ اور کئی رفقاء کیبن میں آکر شکریہ ادا کرتے ہیں کہ یہ بات ہم جمعہ پڑھاتے ہوئے نہیں کر سکتے جو آپ کر جاتے ہیں۔ تو بازار، کلاس، مسجد اور مدرسہ کا ایک ماحول ہے، ہر ماحول میں ہر بات نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی کرنی چاہیے۔ یہ بھی دعوت و تبلیغ کی حکمتوں اور فراستوں کی باریکیوں میں سے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب بھی آپ کو دو معاملات میں اختیار دیا جاتا تو ان میں سے جو آسان ہوتا، آپ اس کی طرف جاتے تھے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا۔ یعنی اگر کسی مسئلے میں دو جائز آپشنز ہوتی تھیں تو رسول اللہ ﷺ ان دو میں سے آسان والی آپشن کو اختیار

کرتے تھے۔ یہ اپنے اسوہ سے امت کی تربیت نہ تھی تو کیا تھا کہ آپ ﷺ آسان مسئلے کو اختیار کر رہے ہیں اور امت کو اپنے عمل سے یہ بتلا رہے ہیں کہ میرے اسوے پر اگر چلنا ہے تو آسانی کی طرف جانا اور آسانی کا رستہ اختیار کرنا۔

اب تو ایسے حضرات اور مشائخ بھی ہیں کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر سختیاں نکالتے ہیں۔ مثال کے طور پر فقہاء میں اس میں اختلاف ہے کہ ایک بچہ کتنی مرتبہ ایک عورت کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہوتی ہے؟ یعنی وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جاتی ہے۔ بعض نے کہا ایک مرتبہ، بعض نے تین مرتبہ، بعض نے پانچ مرتبہ اور بعض نے کہا کہ دس مرتبہ۔ اہل حدیث میں معروف قول یہ ہے کہ پانچ مرتبہ بچہ اگر کسی عورت کا دودھ پی لے تو وہ اس کی رضاعی ماں بنے گی، اس سے کم میں نہیں۔ اب مسئلہ یہ درپیش آیا کہ اگر کسی بچے نے دو مرتبہ کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو کیا وہ عورت اپنی بچی اس کے نکاح میں دے سکتی ہے؟

تو بعض اہل حدیث علماء نے کہا کہ نہیں دے سکتی کیونکہ شک پڑ گیا ہے۔ اچھا کیا اس عورت کی بچی کہ جس کا نکاح اس بچے سے کرنا مشکوک ہے، اس سے پردہ کرے گی؟ ہاں! یہ ضرور کرے گی۔ یعنی جب اس بچے کے فائدے کی بات آئی تو اپنے فتوے میں سختی پیدا کر کے اسے فائدے سے محروم کر دیا کہ نکاح جائز نہیں ہے کہ محرم ہونے کا شک پڑ گیا ہے اور دوسری طرف اسی محرم ہونے کے شک کی صورت میں سہولت یہ تھی کہ پردہ ختم ہو جاتا تو اسے باقی رکھا کہ غیر محرم ہونے کا شک بھی موجود ہے۔ یعنی ایک ہی بچی اس کی محرم بھی بنا دی اور غیر محرم بھی۔ صرف اور صرف دین کے ایک مسئلہ میں سختی پیدا کرنے کے لیے۔ بھئی یا تو احناف کی طرح فتویٰ دے دیں کہ ایک ہی مرتبہ سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے تو کم از کم پردہ تو اتر جائے اور وہ تو ایک نفسیاتی عذاب سے نکل جائے کہ یہ میری محرم ہے یا غیر محرم۔

اس قسم کے فتاویٰ سوسائٹی میں مذاق بن جاتے ہیں اور دین سے تنفر پیدا کرتے ہیں۔ لوگوں کو ایمان اور دین پر قائم رکھنے کے لیے فتویٰ میں سہولت اور نرمی کے پہلو کو ترجیح دینا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے بارے معروف ہے کہ ایک نو مسلم انگریز نے اپنی بیوی کو

ایک مجلس میں تین طلاق دے دیں۔ انہوں نے کہا کہ اسے اہل حدیث علماء سے فتویٰ لے دو اور اس کا رجوع کروا دو تاکہ اس کا ایمان بچ جائے کہ یہ نیا نیا مسلمان ہوا ہے۔ تو آج ہمارے معاشرے کو ایسے مفتیان کرام کی ضرورت ہے۔ میں بھی اہل حدیث کی اس رائے کا قائل ہوں کہ لڑکی اگر ولی کی اجازت کے بغیر گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کر لے تو یہ نکاح نہیں ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ اگر کسی عورت نے ولی کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ لیکن دوسری طرف بھی تو کچھ دلائل ہیں ناں، چاہے ہماری نظر میں اتنے مضبوط نہ ہوں۔ لہذا اگر میرے پاس کوئی ایسا کیس آتا ہے کہ کسی لڑکی نے ایسا کر لیا ہے تو اب میں امام محمد رحمہ اللہ کی رائے کے مطابق رہنمائی کر دیتا ہوں۔

امام محمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ایسا نکاح ولی یعنی والد کی اجازت پر موقوف رہے گا۔ تو میں اس لڑکی کو یہی کہتا ہوں کہ جو کر لیا سو کر لیا، جہالت میں کر لیا، نادانی میں کر لیا، اب باپ کو راضی کرو، اب باپ کو راضی کرو، اب باپ کو راضی کرو۔ اس کے پاؤں پڑ جاؤ اور تمہارا باپ جب راضی ہو جائے گا تو تمہارے اس نکاح میں کوئی حرج نہ رہ جائے گا۔ اس رائے میں مجھے معاشرت اور اخلاق دونوں کا احیاء نظر آتا ہے۔

اب بعض کا اعتراض یہ بھی ہے کہ شریعت میں دونوں مفتیان کرام کی رائے کیسے حق ہو سکتی ہیں جبکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مخالف بھی ہوں؟ بھئی بعض اوقات شریعت میں دونوں گروہ ہی حق پر ہوتے ہیں، چاہے وہ ایک دوسرے کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ صحیح روایات میں ہے کہ غزوہ احزاب کے موقع پر مشرکین کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے مدینہ کے گردو نواح میں رہنے والے ایک یہودی قبیلے بنو قریظہ کا قصد کیا کہ انہوں نے جنگ میں بد عہدی کی تھی لہذا آپ نے ان کا گھیراؤ کرنے کا حکم دیا اور مدینہ میں منادی کروا دی کہ سب عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستیوں کے پاس جا کر پڑھیں۔

اب لوگ اپنی اپنی سہولت سے اپنے گھروں سے نکلے ہیں لہذا کچھ صحابہ کرام کو رستے میں ہی عصر کی نماز آ گئی۔ اب ان میں اختلاف ہو گیا کہ عصر رستے میں ہی پڑھیں یا بنو قریظہ کی بستیوں کے

پاس جا کر پڑھیں۔ جن کا کہنا تھا کہ عصر رستے میں ہی پڑھیں، ان کی دلیل یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد بنو قریظہ کی بستیوں کے پاس جا کر عصر پڑھوانا نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ جلدی چلو اور عصر سے پہلے وہاں پہنچ جاؤ لہذا عصر کا وقت اگر یہاں ہو گیا ہے تو اب ہمیں عصر یہاں ہی پڑھنی چاہیے جیسا کہ قرآن مجید کا حکم ہے کہ نماز اپنے وقت میں ہی فرض کی گئی ہے۔ اور یہ فقاہت تھی۔ دوسری طرف کے صحابہ کرام نے کہا کہ یہ جو مفہوم تم نے نکالا ہے، یہ تمہارا مفہوم ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے ظاہر الفاظ یہ تھے کہ عصر وہاں جا کر پڑھو لہذا ہم عصر وہاں جا کر ہی پڑھیں گے، چاہے عشاء کے بعد پڑھیں۔ اور یہ ظاہریت تھی۔ تو کچھ لوگوں نے راستے میں عصر کے وقت میں عصر کی نماز پڑھ لی اور کچھ نے بنو قریظہ کی بستیوں کے پاس جا کر عشاء کے بعد ادا کی۔ صحیح بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے کسی گروہ پر بھی سختی نہیں فرمائی یعنی خاموشی اختیار کی گویا کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہو گئیں۔

اسی طرح بعض اوقات دونوں مفتیان کرام حق پر نہیں ہوتے بلکہ ایک حق پر ہوتا ہے لیکن ثواب دونوں کو ملتا ہے۔ تو ان میں ایک حدیث کے الفاظ کے مطابق مصیب ہے یعنی صحیح رائے پر ہے اور دوسرا مخطئ ہے یعنی خطا پر ہے لیکن خطا کرنے کے باوجود چونکہ نیت خالص ہے لہذا اسے بھی ثواب ملے گا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مفتی سے اگر مسئلے میں خطا بھی ہو جائے تو بھی اسے اور اس کے فتوی پر عمل کرنے والوں کو گناہ نہ ہو گا بلکہ ثواب ملے گا جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اگر حکمران کوئی فیصلہ کرے اور اس میں غلطی کر بیٹھے [مثلاً لوگوں کے جھگڑے میں کسی کا حق نہیں بنتا تھا لیکن اسے دے بیٹھا] تو اس حکمران کے لیے ایک گنا اجر ہے اور اگر صحیح رائے تک پہنچ جائے یعنی صحیح فیصلہ کر پائے تو اس کے لیے تو دو گنا اجر ہے۔ تو یہی حکم قاضی اور عالم دین کے لیے بھی ہے بشرطیکہ اس میں اہلیت، اخلاص اور سچائی ہو۔ اہلیت سے مراد یہ ہے کہ وہ قاضی اور عالم دین اس قدر علم رکھتے ہوں جو قاضی اور عالم دین بننے کے لیے ضروری ہو ورنہ تو ایک نااہل اور جاہل شخص اگر قاضی اور مفتی بن کر لوگوں کے فیصلے کرنا یا انہیں فتوے دینا شروع کر دے گا تو یہ تو لازماً گناہ گار ہو گا۔

آپ اپنے مدارس کے ماحول میں ضرور حرام حرام کریں، قانونی زبان دبا کر استعمال کریں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ سوسائٹی میں اپنے کثرت استعمال کی وجہ سے ایسے الفاظ اپنے معانی کھو چکے ہیں۔ پہلے کسی شخص کو مفتی صاحب کہتے تھے کہ یہ حرام ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اب کسی کو کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے تو اس کا ریسپانس یہ ہوتا ہے یار ان مولویوں نے تو ہر چیز کو حرام ہی بنا رکھا ہے، اسلام میں کچھ حلال بھی ہے کیا، وغیرہ وغیرہ۔ جب الفاظ اپنی قدر اور معانی کھو دیں تو ان کا استعمال کرنا کوئی حکمت نہیں ہے۔ اس لیے میں نے جب بھی کسی کو کسی کام سے روکنا ہوتا ہے تو میں اسے یہی کہتا ہوں کہ بھئی یہ جائز نہیں ہے۔

البتہ کسی کام کے لیے شریعت نے صریحاً حرام کا لفظ استعمال کیا ہو تو پھر ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن جہاں حرام کا لفظ استعمال نہ ہوا ہو تو وہاں حرام کا لفظ استعمال کرنا بھی تو ایک بہت بڑی دینی ذمہ داری ہے کہ جس کے لیے صریح دلیل چاہیے کہ اللہ عزوجل نے مشرکین مکہ پر یہی تو تنقید کی ہے کہ جس شیء کو اللہ نے حرام نہیں کہا، اسے حرام کہہ رہے ہیں: ﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ ﴾۔ ترجمہ: [یہ کیا تم نے تماشا لگا رکھا ہے] کہ اپنی زبانوں سے یہ کہہ رہے ہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، ایسا مت کہو۔ اس لیے بعض روایات میں ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اس چیز کے لیے کہ جس کے لیے شریعت میں صریحاً حرام کا لفظ نہ ہوتا تھا، اس سے روکنے کے لیے مکروہ یعنی ناپسندیدہ کا لفظ استعمال کرتے تھے اور مراد ان کی وہی حرمت ہوتی تھی۔ اگر کسی نے اپنی نرمی سے کسی حرام کو حلال بنا لیا ہے اور یہ ہماری نظر میں بہت بڑا گناہ ہے تو ہم نے کبھی سوچا کہ اگر ہم نے اپنی سختی سے کسی حلال کو حرام بنا دیا تو یہ بھی اللہ کی شریعت کے ساتھ ویسا ہی ایک کھیل اور تماشا نہیں ہے۔

بھئی اس وقت سوسائٹی میں کرنے کا کام فتوی، فقہ اور قانون کی زبان کا استعمال نہیں ہے کہ سوسائٹی کے پاس وہ دل ہی نہیں ہے جو تمہارے فتاوی کو جگہ دے سکے بلکہ اصل کام ترغیب و تشویق، دعوت و تبلیغ اور حکمت و بصیرت کی زبان کے استعمال کا ہے۔ اور اس طرح نرمی اور منت سماجت سے لوگوں کو دین پر لائیں۔ پچھلے رمضان کی بات ہے کہ طاق راتوں میں اپنے بیٹے کو بھی

اپنے ساتھ تراویح وغیرہ کے لیے لے جاتا ہوں تو ایک رات بارہ بجے گھر واپسی ہوئی کہ تراویح کے ساتھ دورہ ترجمہ قرآن کروار ہا تھا لہذا اتنا خیر ہو جاتی تھی کہ روزانہ جو پارہ تراویح میں پڑھتے تھے، اس کا مکمل ترجمہ اور مختصر تشریح بھی بیان کرتے اور لوگ دلجمعی سے بیٹھتے تھے اور یہ سب ہمارے استاذ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی ترغیب و تشویق کے نتائج ہیں۔ اور دوسری طرف اکثریت تراویح بھی نہیں پڑھتی ہے کہ انہیں صحیح طرح سے ترغیب (motivation) ہی نہیں دی گئی اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ترغیب دینے کا مزاج ہی ختم ہو گیا ہے، اب تو دین کے تھانیدار اور ٹھیکیدار ہیں ہم۔

تو رات بارہ بجے گھر آ کر میں نے کچھ نفل پڑھنے کا ارادہ کیا کہ طاق رات ہے، کچھ عبادت ہی کر لوں۔ بچے نے پوچھا کہ کیا کرنے لگے ہیں؟ میں نے کہا کہ آج طاق رات ہے اور اس میں عبادت کی یہ یہ فضیلت ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے بھی آپ کے ساتھ نفل پڑھنے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ نفل پڑھے کہ میں نے ذرا لمبا قیام کرنا تھا اور مجھے یہ تھا کہ یہ تھک جائے گا لہذا میں نے اصرار کیا کہ تم سو جاؤ، تم نے کافی عبادت کر لی ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں، میں نہیں تھکا، میں بھی پڑھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو دو رکعت میں سیپارہ ختم کروں گا؟ اس نے کہا کوئی بات نہیں۔

بہر حال میں نے دو رکعت میں سیپارہ مکمل کیا اور مجھے زیادہ حیرانگی اس وقت ہوئی جبکہ میں دوسری دو رکعت کے لیے کھڑا ہوا تو وہ اور بھی مستعدی سے میرے ساتھ اگلی دو رکعت کے لیے بھی کھڑا ہو گیا۔ تو اگر تو آپ نے اپنے بچے کو سختی کے نام پر پہلے ہی سے دین سے چڑا رکھا ہو گا تو وہ کبھی بھی اتنی سی ترغیب سے ترغیب نہیں پائے گا۔ میں یہ واقعات ساتھ ساتھ اس لیے ذکر کر رہا ہوں کہ یہ بتلا سکوں کہ میں نے اپنے منہج دعوت و تربیت سے کیسے کیسے نتائج حاصل کیے ہیں۔ ناقدین سے بھی عرض ہے کہ وہ بھی ضرور بیان کریں کہ اپنے بیوی بچوں پر سختی سے انہوں نے ان میں دین کی کتنی محبت پیدا کر دی ہے یا بیوی بچوں پر دین کے نام پر سختی سے انہیں یہ یہ نتائج حاصل ہوئے ہیں جو وہ دین کے نام پر بیوی بچوں پر سختی کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ اس سے آپ کا منہج صرف کتابی نہیں رہ جاتا بلکہ اگلے کو یہ تاثر جاتا ہے کہ یہ قابل عمل بھی ہے۔

یہ نرمی ہی کا تو نتیجہ ہے کہ یونیورسٹی میں مجھ سے اسلامیات پڑھنے والے بعض طلباء اگلے سمسٹر

میں آکر کہتے ہیں کہ سر ہماری کلاس نہیں ہے تو کیا آپ کی کلاس میں بیٹھ سکتے ہیں؟ اگرچہ ایسے بچے کم ہیں لیکن اسلامیات ان کے لیے ایسی انجوائے منٹ بن جائے کہ ان کو کیفے ٹیریا میں جتنا مزہ آتا ہے، وہی اسلامیات کی کلاس لینے میں آئے تو یہ کیا کم نعمت ہے؟ میں نے تو اس منہج کے مطابق سینکڑوں یونیورسٹی طلباء سے نمازیں پڑھوائیں کہ یہ کہتا رہتا تھا کہ صرف فرض پڑھ لیا کرو یا اگر یونیورسٹی بس میں آتے جاتے کسی نماز کا وقت نکل جاتا ہے تو ظہر عصر اور مغرب عشاء کو جمع کر لیا کرو لیکن پڑھو ضرور۔ تو سینکڑوں نے پڑھی ہیں اور شاید ان میں سے دسیوں آج بھی پڑھ رہے ہوں گے، واللہ اعلم۔ تو دین پر لانا اصل مقصد ہے، باقی دین پر لانے کے ذرائع تو ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ سب اللہ عزوجل کی توفیق سے ہے، ہماری نرمی سے کوئی نتیجہ نکلا ہو یا آپ کی سختی سے۔

اب اگر آپ یہ سوال کریں کہ دین میں نرمی کی بابت تو ہم نے بہت کچھ سن لیا تو کیا دین میں سختی بالکل بھی نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دین میں سختی ہے لیکن اس سختی کا موقع و محل، ترتیب و نظم، معیار و مقدار اور حکمت و مقصد کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے نتائج وہ حاصل نہیں ہو پاتے جو کہ دین کا مقصود ہیں۔ دین کا مقصد سختی کے ذریعے بگاڑ کو ختم کرنا ہے اور اگر آپ کی سختی سے بگاڑ پیدا ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے تو آپ یا تو موقع و محل کے مطابق سختی نہیں کر رہے، یا دین میں سختی کی بتلائی ہوئی ترتیب و نظم کو ملحوظ نہیں رکھ رہے یا پھر دین میں سختی کے معیارات و مقدارات کا لحاظ نہیں کر رہے ہیں یا پھر سختی کا انداز حکمت و بصیرت سے خالی اور مقصود کے حصول سے عاری ہے۔ لہذا جسے آپ دینی سختی سمجھ رہے ہیں، وہ دینی نہیں ہے بلکہ خود کی تراشیدہ اور گھڑی ہوئی نفسانی سختی ہے۔

سنن ابو داؤد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تمہارے بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کا حکم دو۔ اور جب دس سال کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو ان پر سختی کرو۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ حدیث میں سختی کی ایک ترتیب نقل ہوئی ہے کہ پہلے تین سال نماز کا کہتے رہو یعنی سات سال سے دس سال تک اور اب تین سال کے کہنے کے بعد بھی نہ پڑھے تو اس پر سختی کرو۔ اور اگر آپ نے اپنے بچے کو نماز پڑھنے کا پہلی مرتبہ کہا ہی دس سال کی عمر میں ہے اور اس نے انکار کر دیا اور آپ نے ہاتھ اٹھا دیا تو یہ سختی شریعت کی ترتیب پر نہیں ہوئی لہذا اس سے اصلاح کی

امید نہ رکھیں۔

مولانا یوسف خان صاحب، استاذ جامعہ اشرفیہ سے خطبہ جمعہ کے بعد ایک نمازی نے سوال کیا کہ حدیث میں آتا ہے کہ بچہ دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اس پر سختی کرو۔ میں نے اپنے بچے پر سختی کی ہے تو وہ مجھ سے سیدھا ہو گیا ہے اور بد تمیزی پر اتر آیا ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ آپ کے بچے کی عمر کیا ہے؟ نمازی نے بتلایا کہ سترہ سال ہے۔ مولانا نے کہا کہ اس سے پہلے کبھی بچے کو نماز کے لیے کہا۔ تو وہ کہنے لگے کہ نہیں کہا۔ تو مولانا نے کہا کہ بس یہی وجہ ہے کہ اگر آپ سات سال کی عمر میں بچے کو نماز کا کہنا شروع کرتے اور دس سال کی عمر میں اس پر سختی کرتے تو وہ کبھی جواب میں ویسی بد تمیزی نہ کرتا کہ جس کا آپ اب شکوہ کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث میں دس سال کے بچے پر سختی کا حکم ہے، بیس سال کے بچے پر نہیں۔ دس سال کے بچے کو تھپڑ ماریں گے تو ریسپانس اور ہو گا اور بیس یا تیس سال کے بچے کو ماریں گے تو ردعمل بالکل مختلف ہو گا۔ تو سختی کرنے کی ایک عمر ہے اور والدین سختی کی عمر میں تو سختی نہیں کرتے لیکن جب وہ عمر گزر جاتی ہے تو اب انہیں سختی یاد آتی ہے جبکہ اب اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔ بچوں پر سختی کی بہترین عمر تین سے دس سال کی ہے۔ اس کے بعد ان میں سختی قبول کرنے کی لچک ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر سنن ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ اگر کسی کو مارنا ہو تو چہرے سے بچو اور ہمارے ہاں تو جب تک تھپڑ چہرے پر نہ مارا جائے تو جیسے سکون ہی نہیں ملتا یا غصہ دور ہی نہیں ہوتا اور بڑے اہتمام سے ٹکا کر چہرے پر مارتے ہیں۔ جس بچے کو آپ چہرے پر ماریں گے، اس کی عزت نفس مجروح ہو گی اور وہ اپنی خوب تذلیل محسوس کرے گا۔ پس یہ مار اس کی اصلاح کا ذریعہ نہیں بن پائے گی کہ اس مار کا ناخوشگوار تاثر اس کے شعور میں مدتوں باقی رہ جائے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مارنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہڈیاں توڑنی ہیں جیسا کہ ہمارے ہاں عرصہ دراز تک اسکولز اور مدارس میں یہ تصور عام رہا ہے کہ استاذ کی مار جسم کے جس جس حصے پر اپنا نشان چھوڑ جائے تو اس نشان کو برکت اور فضیلت کا باعث سمجھنا چاہیے حالانکہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی مار سے منع فرمایا ہے کہ جس سے جسم پر کوئی نشان باقی رہ

جائے۔ پس جس مار کی شریعت میں اجازت ہے، وہ بہت ہی ہلکی سی مار ہے۔ ہمارے ہاں کوڑوں کے بارے لوگوں کا تصور یہ ہے کہ جب کسی شرعی حد میں یہ لگائے جاتے ہوں گے تو شاید مجرم کی جلد اکھڑ جاتی ہو گی جبکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ایک شخص کو لایا گیا کہ جس نے شراب پی ہوئی تھی تو آپ نے کہا کہ اس پر چالیس کی حد جاری کرو۔ تو صحابہ کرام میں سے کسی کے ہاتھ میں جوتا تھا تو اس نے اسے جوتا لگا دیا اور کسی کے ہاتھ میں چھڑی تھی تو اس نے اسے چھڑی لگا دی بلکہ صحیح بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ کسی کے ہاتھ میں اپنی چادر تھی تو اس نے اسے وہ لگا دی۔ البتہ دو حدود ایسی ہیں کہ جن میں سزا کو عبرت بنایا گیا یعنی چوری کی حد اور رجم کی حد۔

پھر قرآن مجید میں بیوی کو مارنے کی جو اجازت وارد ہوئی ہے، اس پر ہم گفتگو کر چکے ہیں کہ سنن ابو داؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، وہ اچھے نہیں ہیں۔ پھر قرآن مجید نے ایک ترتیب کا ذکر کیا ہے کہ بیوی کی طرف سے نشوز یعنی سرکشی کو دیکھو تو اسے نصیحت کرو۔ اگر نصیحت بے کار جا رہی ہے تو پھر اس سے بستر علیحدہ کر لو۔ اگر اس کا بھی فائدہ نہیں ہو رہا ہے تو اب سختی کر سکتے ہو یعنی اجازت ہے، لازم اب بھی نہیں ہے۔ یہاں اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مرد کو بیوی پر سختی کی اجازت اس وقت دی گئی ہے جبکہ وہ بستر علیحدہ کر چکا ہو۔ اب تو یہاں دن میں اسے تھپڑ مارے گا اور رات کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے اس کے قریب جائے گا تو یہ تو سختی کی دینی ترتیب نہیں ہے بلکہ نفسانی ہے۔ اسی لیے تو صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ صبح اپنی بیوی کو یوں مارتے ہوں جیسے غلاموں کو مارا جاتا ہے اور شام کو اس سے ہم بستری کرنے پہنچ جاتے ہو! تو یہ تو انسانی نفسیات کے خلاف ہے ناں۔

قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ پہلے مرد بستر علیحدہ کر کے یہ ثابت کر دے کہ اس میں ضبط نفس ہے، اپنے اوپر کنٹرول ہے تو اب سختی کر سکتا ہے کہ ضبط نفس (self-control) کے ساتھ جو سختی ہوتی ہے، وہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اب بستر تو علیحدہ کر نہیں سکتے کہ اپنے اوپر کنٹرول تو ہے نہیں، بس ہاتھ اٹھاتے جاؤ۔ تو یہ سختی کی ایک ترتیب ہے کہ جسے نظر انداز کر کے کی جانے والی سختی اصلاح کی

بجائے بگاڑ کا باعث بنے گی جیسا کہ ہو رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں نشوز کی صورت میں بیوی پر سختی کی اجازت ہے۔ نشوز کا معنی گناہ گار ہونا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد سرکشی ہے۔ گناہ اور سرکشی میں فرق ہے کہ گناہ تو معمولی بھی ہو سکتا ہے لیکن سرکشی ہمیشہ بڑے گناہ میں ہوتی ہے جیسا کہ سنن ترمذی کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے صریح بے حیائی اور فحش کام کے ارتکاب کو نشوز کہا ہے۔ پھر گناہ گار اور باغی میں فرق ہوتا ہے۔ گناہ گار تو سب ہیں۔ گناہ گار یعنی جس میں گناہ کا احساس اور شرمندگی باقی ہو، سے ممکن حد تک نرمی کی جائے گی۔ اور جس میں گناہ کا احساس ہی ختم ہو جائے اور وہ بغاوت پر اتر آئے تو اس کو بھی پہلے نرمی اور وعظ و نصیحت ہی سے سمجھایا جائے گا جیسا کہ فرعون کے حوالے سے آیت گزر چکی اور اگر پھر بھی باز نہ آئے تو اس پر سختی کی جا سکتی ہے۔

اسی صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ہر آدمی کے حصے کا زنا اللہ عزوجل نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے جو اس نے کر کے رہنا ہے۔ تو یہ گناہ تو انسان کی تقدیر میں لکھا ہے البتہ حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ جو زنا ہر انسان کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے، اس سے مراد آنکھوں کا زنا، ہاتھوں کا زنا اور زبان وغیرہ کا زنا ہے۔ اور آخری درجے یعنی شرم گاہ کا زنا تو ہر کسی کی تقدیر میں نہیں ہے۔ تو علماء سے گزارش ہے کہ آپ گناہ گاروں سے نرمی سے پیش آئیں کہ آپ خود بھی گناہ گار ہی ہیں۔ اور احقر العبد یا ننگ خلائق لکھنے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا کہ جس دن آپ کے دل میں اپنے گناہ گار ہونے کا یقین کسی بھی درجہ میں آجائے گا تو آپ خود سے گناہ گاروں کے حق میں نرم ہو جائیں گے۔ بھئی اس تقوے کا کیا بھروسا کہ کل اللہ کی طرف سے کوئی ایسی سخت آزمائش آجائے کہ انسان دس سال کا تزکیہ دس دنوں میں قے کر دے۔ اللہ ہم علماء کے پردے رکھے اور ہمیں بچا کر رکھے۔ ہم واقعتاً کچھ نہیں ہیں۔ ان عوام الناس کے مقابلے میں بالکل کچھ نہیں ہیں کہ نہ معلوم ان میں سے کوئی ایک حقیر سی نیکی کے بدلے جنت میں جا رہا ہو اور ہم علماء کثرت اعمال کے باوجود اس امت کے مفلس کا لقب پا رہے ہوں جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک شخص قیامت والے دن نیکیاں تو بہت لے کر آئے گا لیکن چونکہ اس نے بہت سے لوگوں کے حقوق دینے ہوں گے لہذا اس کی نیکیاں ان لوگوں

میں بانٹ دی جائیں گی۔ اور اگر پھر بھی لوگوں کے حقوق باقی رہتے ہوں گے تو لوگوں کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال کر حساب برابر کیا جائے گا۔ اور اس طرح پہاڑوں کے برابر نیکیاں لانے والا اپنی ساری نیکیاں لٹا کر اور اس کے بدلے میں گناہ لے کر جہنم میں چلا جائے گا۔

اللہ ہم علماء کے پردے رکھے اور ہمیں بچا کر رکھے۔ ہم واقعتاً کچھ نہیں ہیں۔ ان عوام الناس کے مقابلے میں بالکل کچھ نہیں ہیں کہ نہ معلوم کسی گناہ گار پر آخر وقت میں تقدیر غالب آجائے اور وہ جنت میں چلا جائے اور کسی عالم دین پر آخر وقت میں تقدیر غالب آجائے اور وہ جہنم میں چلا جائے جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص نیکی کے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس میں اور جنت میں ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ ایسے اعمال کرنا شروع کر دیتا ہے کہ جن کہ وجہ سے جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح ایک شخص گناہ پر گناہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے مابین ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے لیکن تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ نیک اعمال کرنا شروع کر دیتا ہے کہ جو اس کے جنت میں داخل ہونے کا سبب بن جاتے ہیں۔ تو مجھے کیا معلوم کہ میرا خاتمہ کس پر ہونا ہے البتہ ایک امید ہے کہ اچھا ہی ہو گا لیکن محض اس امید کی بنیاد پر میں کسی گناہ گار کو کیسے حقیر سمجھ سکتا ہوں!

اور اب تو مفتی صاحب کے تقوی کا اتنا رعب ہے کہ کوئی دنیادار بے چارہ ان کے سامنے اپنے گناہ کا تذکرہ بھی نہیں کر سکتا کہ اس سے کیسے نکل سکے، اس بارے ان سے کوئی مشورہ ہی لے سکے۔ میرے سامنے ایک دار الافتاء میں ایک مفتی صاحب نے سائل کو پینٹ شرٹ پہنے ہونے کی وجہ سے جھاڑ پلا دی۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک صاحب حاضر ہوتے تھے جنہیں عبد اللہ الحمار کہا جاتا تھا یعنی لوگ مزاح میں انہیں گدھا کہتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایسی باتیں کرتے تھے کہ جس پر آپ مسکرا اٹھتے یعنی وہ صحابی طبعاً خوش مزاج تھے لیکن شراب کی عادت اور لت میں پڑے تھے۔ ایک مرتبہ نشے کی حالت میں لائے گئے تو ان پر حد جاری ہوئی۔ دوبارہ لائے گئے تو حد جاری ہوئی۔ تو کسی نے کہا کہ اللہ اس پر لعنت کرے، اسے شرم ہی نہیں آتی کہ باز ہی آجائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ

بھیجو، یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہے۔

پھر جہاد سے زیادہ سختی دین کے کس حکم میں ہو گی لیکن وہاں بھی سختی سے پہلے نرمی کا حکم ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق جب آپ ﷺ کفار کی طرف کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو انہیں یہ حکم دیتے تھے کہ لڑنے سے پہلے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنا اور اگر وہ قبول کر لیں تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تو ایک کلمہ پڑھ لینے سے کافر تمہارے درجے (status) میں آجاتا ہے اور جس پر تم نے تلوار اٹھائی ہوئی ہے، اسے گلے لگانے کا حکم آجاتا ہے تو یہاں تو سب پہلے ہی سے مسلمان ہیں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والے ہیں، ان سے اتنا بغض کیوں، ان سے اتنی نفرت کیوں، اور وہ بھی دین کے نام پر۔ تو اسی روایت میں ہے اگر وہ کافر مسلمان ہونے سے انکار کر دیں تو لڑائی اب بھی نہیں کرنی بلکہ انہیں یہ آپشن دینی ہے کہ وہ تمہیں جزیہ (tax) دے دیا کریں اور اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزار لیں۔

تو اگر وہ جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو۔ اور اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو اب ان سے لڑائی کی اجازت ہے۔ اور اس لڑائی کے بارے بھی روایات میں ارشاد فرمادیا کہ کافر دشمن سے لڑائی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھانا، کسی بچے کو قتل نہیں کرنا، ان کی کسی لاش کا حلیہ مسخ نہیں کرنا، ان کے بوڑھوں کو قتل مت کرو، ان کے راہبوں کو قتل مت کرو، جو ہتھیار پھینک دے اس کو امن دے دو، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کو امن دے دو، ان سے معاہدہ کر لو تو ہر حال میں اسے پورا کرو وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ سختی میں بھی نرمی پیدا کی جا رہی ہے اور ہمارے ہاں بدقسمتی سے ساری توجہ اس پر ہے کہ نرمی سے سختی کیسے نکالی جا سکتی ہے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن مجید کے بیان میں سختی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے مزاج کی نرمی سے اس سختی میں اعتدال پیدا ہوا ہے، اس لیے قرآن مجید کے ساتھ اسوہ رسول کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ تو فساد کے امکانات زیادہ ہیں کہ جس تحریک کی بنیاد محض قرآن مجید پر ہو گی یا اس میں حدیث پڑھنے پڑھانے سے شغف کم ہو گا تو اس میں تشدد آجائے گا۔ ہم نے تو سیرت کے نام پر ایسی کتابیں مرتب کر دیں ہیں کہ جن کا پہلا تاثر ہی قاری (reader) کو یہ جاتا ہے کہ جیسے

سیرت جنگ وجدال ہی کا دوسرا نام ہو اور دوسری طرف قرآن مجید انہیں رحمۃ اللعالمین کہہ رہا ہے۔ جہاد و قتال سیرت کا ایک پہلو ہے لیکن کل سیرت نہیں ہے۔ اور تو اور مسلمانوں کی تاریخ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں تو آپ کو مسلم تاریخ کے نام پر جنگ وجدال کے علاوہ کچھ نہ ملے گا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں نے دنیا میں صرف یہی کام کیا ہے یا یہی کام کرنے آئے ہیں حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ البتہ مقدمہ ابن خلدون اس اعتبار سے ایک شاہکار ہے کہ اس نے مسلمانوں کی تاریخ کے علمی، نفسیاتی، ثقافتی اور تہذیبی پہلوؤں کو بھی خوب نمایاں کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مزاج میں تو اس قدر نرمی تھی کہ قرآن مجید کو یہ کہنا پڑا کہ ﴿وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ ترجمہ: آپ کفار اور منافقین پر سختی فرمائیں۔ تو اس مزاج نبوی سے آج یہ بحیثیت مجموعی محروم ہے۔ اور اگر اس امت کے علماء کو بھی یہ مزاج نبوت حاصل ہو جائے تو ان کی سختی ضرور رنگ لائے۔ اور پھر نو مرتبہ نرمی کر کے تو دیکھیں، پھر دسویں مرتبہ سختی کریں گے تو نتیجہ حاصل ہو گا۔ اور جہاں دس میں سے نو مرتبہ میں تو سختی ہی سختی ہے تو وہاں دین سے تنفر پیدا نہ ہو تو کیا ہو۔ نرمی کرنے سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تعلق پیدا ہو جائے تو پھر مخاطب اس تعلق کی بنا پر نہ صرف سختی قبول کر لیتا ہے بلکہ اس کی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ اب یہاں تعلق تو ہے نہیں لیکن اصلاح کے نام پر ڈانٹ ڈپٹ اور جھاڑ پلانے پر سب خوب لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے لیے محبت کیا ہونی ہے، وہ تو بہت بڑا لفظ ہے، وہ تو میں اپنے اس ہم مسلک سے بھی نہیں کر سکتا کہ جس سے مجھے کوئی سیاسی یا تنظیمی یا اجتہادی نوعیت کا اختلاف ہے۔

یہاں تو دلوں میں غصہ، نفرت، عداوت، دشمنی، بغض اور کینہ بھرا ہوا ہے اور اب دین کے نام پر ہم سختی کرنا چاہتے ہیں تو اس سختی سے بگاڑ اور فساد تو پیدا ہو سکتا ہے، اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بچے پر غصہ آ جانا اور غصہ کرنے میں بھی فرق ہے۔ جب غصہ آ جائے تو اس کی اصلاح کے لیے سختی نہ کریں۔ البتہ جب غصہ کر رہے ہوں تو اس کی اصلاح کے لیے سختی کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اور ہماری یہ بات کوئی استاذ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ یہ حکمت دین ہے کہ جس کا لحاظ ضروری ہے۔ ہمیں صرف اخلاق کی بلندی نہیں چاہیے بلکہ ذہنی پستی سے بھی نکلنا ہو گا کہ پست ذہن دین کی ایسی تعبیر

اور تشریح کرے گا کہ جو حکمت اور فراست سے خالی ہو گی۔

سنن ترمذی کی ایک روایت کہ جسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ارشاد فرمایا کہ تمہارے بعد ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ جس میں دین پر قائم رہنا ایسا ہی مشکل ہو گا جیسا کہ ہاتھ میں آگ کا انگارا پکڑنا اور اس زمانے میں دین پر عمل کرنے والا کا اجر پچاس اشخاص کے برابر ہو گا۔ تو صحابہ نے عرض کی کہ اللہ کے رسول ﷺ کیا یہ پچاس ان کے ہوں گے یا ہمارے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے۔ تو جہاں اس حدیث میں مشکل حالات میں دین پر عمل کرنے کی ترغیب و تشویق ہیں، وہاں یہ بھی تو ہدایت اور رہنمائی موجود ہے کہ ایسے حالات میں اگر لوگ دین پر تھوڑا سا عمل بھی کریں تو ان کی حوصلہ افزائی کرو کہ مشکل حالات کی وجہ سے دین پر ان کے تھوڑے سے عمل کا اجر بہت بڑا ہے۔

آسانی کے معاملے سے کیا مراد ہے کہ ہم عوام کے لیے دین کو بدل دیں؟ نہیں، ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ حرام کو حلال بنا دیں۔ ہم تو وہ کہہ رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو یعنی گناہ گاروں میں توبہ کی ترغیب اور تشویق بڑھا دیں۔ جب گناہ بہت پھیل جائے اور عام ہو جائے تو لوگوں کے توبہ کرتے رہنے کو بھی بہت بڑی نیکی سمجھ لیں، چاہے گناہ ان سے نہ بھی چھوٹ رہا ہو۔ اگر کوئی گناہ چھوڑ دے تو یہ تو بہت اچھا ہے لیکن اگر کسی سے گناہ نہ چھوٹ رہا ہو تو اس کے لیے بھی کیا شریعت میں کوئی رہنمائی ہے یا نہیں؟ تو بالکل ہے۔ ہم نے دین کا ایسا خوفناک تصور پیش کر رکھا ہے کہ ایک گناہ گار شخص جو گناہ نہیں چھوڑ پاتا، توبہ بھی چھوڑ دے گا، یہ سوچ کر کہ اس دین میں اس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عادی گناہ گاروں کے توبہ سے مایوس ہو جانے سے بڑی دلیل کیا ہو گی کہ ہم علماء تصور دین بھی غلط ہے اور تصور خدا بھی۔ اور مجھے معاشرے میں ایسے بیسیوں گناہ گاروں سے واسطہ پڑتا ہے جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہیں۔ یہ مایوسی انہیں کہاں سے حاصل ہوئی؟ ظاہر ہے اسی دینی تعبیر سے جو معاشرے میں عام ہے اور وہ ہم علماء کی پھیلائی ہوئی ہے۔ آپ ایک چھوٹا سا تجربہ کر لیں کہ اپنے گرد اگرد موجود دس بچوں سے یہ پوچھ لیں کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو تمہارے ذہن میں خدا کا کیا تصور آتا ہے؟ تو ان

دس میں سے نو نہیں بلکہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ دس کے دس خدا کا ایسا تصور بیان کریں گے جو ڈراؤنا ہو گا۔ تو یہ تصور خدا کیا وہ بچہ خود خدا کی طرف سے لے کر آیا ہے یا ہم نے اس کے ذہن میں ڈالا ہے؟ تو بلاشبہ ہم نے ہی اس کے ذہن میں اُس خدا کا ایسا ڈراؤنا تصور ڈال دیا کہ جس کا اپنی کتاب میں کہنا یہ ہے کہ میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے بلکہ اس کی رحمت تو اتنی بڑی ہے کہ اس کے اپنے غضب پر بھی چھائی ہوئی ہے۔ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم علماء نے خدا کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ جیسے وہ ہر وقت غصے کی حالت میں ہو اور اپنے نافرمانوں کو جہنم میں ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالی جمیل ہے، خوبصورت ہے، کبھی ہمارے بچوں کے ذہن میں خدا کا ایسا تصور بھی آیا ہے کہ جس کا تعلق حسن وجمال سے ہو۔ اگر نہیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟

ایک نوجوان جو مشت زنی (masturbation) کی عادت اور لت میں مبتلا تھا، جب جب علماء سے اس بارے پوچھتا کہ شادی کے حالات نہیں ہیں اور عادت چھوٹ نہیں رہی تو وہ اسے روزہ رکھنے کا مشورہ دیتے۔ اب ایک شخص میں اتنا ہی ضبط نفس (self-control) ہوتا تو وہ اس عادت اور لت میں ہی کیوں مبتلا ہوتا لہذا یہ مشورہ رائیگاں گیا کیونکہ مخاطب کے حالات کے مطابق نہ تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ تم توبہ نہ چھوڑنا لیکن وہ مجھ سے بار بار یہ کہے کہ میرا توبہ کو دل نہیں کرتا کہ معلوم نہیں خدا مجھے معاف کرے گا بھی کہ نہیں۔ میں نے کہا دیکھو بات یہ ہے کہ گناہ کرنا ایک گناہ ہے جو تم سے چھوٹ نہیں رہا لہذا اب توبہ نہ کرنا یہ ایک دوسرا گناہ ہے، کم از کم اس دوسرے گناہ کو تو چھوڑ دو۔ اب وہ مجھے جواب میں کہے کہ صبح توبہ، شام کو توبہ، یہ تو توبہ نہیں مذاق ہو گیا ناں۔

ایسے ہی لوگ بالآخر اپنے رب سے اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔ تو گناہ گار تو امت سے ختم نہ ہوں گے، ہمیشہ رہیں گے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ انہیں خدا سے متعلق رکھیں اور یہ کام توبہ کے عمل سے کروایا جا سکتا ہے، فتوے لگا کر نہیں کہ اس سے جوان کا دین سے تھوڑا بہت تعلق ہے، وہ بھی جاتا رہے گا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے گناہ کیا اور کہا کہ یا اللہ! میرا گناہ معاف فرما دے۔ تو اللہ عزوجل نے کہا اچھا، میرے بندے میں یہ احساس ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور اس پر پکڑ بھی لیتا ہے۔ اس شخص نے دوبارہ گناہ

کر لیا اور کہا کہ یا اللہ ! میرا گناہ معاف فرمادے۔ تو اللہ عزوجل نے دوبارہ یہی کہا۔ اس بندے نے تیسری مرتبہ گناہ کر لیا اور کہا کہ یا اللہ ! میرا گناہ معاف فرمادے۔ تو اللہ عزوجل نے تیسری مرتبہ بھی یہی کہا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اے میرے بندے، شرمندگی کے احساس اور توبہ کے رویے کے ساتھ جتنی بار مرضی گناہ کر لے، میں تجھے معاف کرتا رہوں گا۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے رمضان کے مہینے میں اپنی بیوی سے جماع (intercourse) کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو آپ نے کہا کہ اپنے گناہ کے کفارے میں ایک غلام آزاد کر سکتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا چلو، دو ماہ کے روزے رکھ لو۔ اس نے کہا کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا بلکہ بعض روایات میں ہے کہ اس نے یہ کہا کہ جو رمضان میں صبر نہ کر سکا، اس سے آپ یہ امید رکھ رہے ہیں کہ دو ماہ کے روزے رکھ لے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اچھا اتنا تو کر لو کہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا دو۔ اس نے کہا کہ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا کہ بیٹھ جاؤ تو وہ شخص آپ کی مجلس میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک صحابی صدقے کی کھجوروں کا ایک ٹوکرا لے کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس گناہ گار سے کہا کہ یہ کھجوریں لے جا اور غریبوں میں تقسیم کر دے۔ تو وہ کہنے لگا کہ مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کوئی نہیں ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہا کہ جا کھجوریں لے جا اور خود بھی کھا اور اپنے گھر والوں کو بھی کھلا۔ آج آپ کو دینی فتاوی میں ایسی نرمی دیکھنے کو ملتی ہے کیا؟ تو اس نرمی نے کیا اس کے دل کو دین اسلام کی نعمت پر شکر سے بھر نہ دیا ہو گا کہ گناہ لے کر آیا ہے اور کھجوریں گھر لے کر جا رہا ہے۔ اور ہمیں یہ خوف ہے کہ نرمی اسے دین سے دور کر دے گی !

بھئی گناہ تو ہوتا رہے گا، یہ تو ختم نہیں ہو گا کہ یہ انسان کی تقدیر ہے۔ انسان جتنا مرضی اپنا تزکیہ کر لے، رہے گا تو انسان کا انسان ہی۔ تو سب لوگوں کے حالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ کی اصلاح آپ اس طرح کریں گے کہ ان کا گناہ چھوٹ جائے اور وہ معصیت کو ترک کر دیں۔ کچھ سے گناہ نہیں چھوٹ پائے گا، آپ انہیں توبہ پر لگا دیں گے تا کہ اللہ کی ذات سے تعلق میں بندھے رہیں۔ پھر ایک اور تدبیر یہ ہے کہ اگر گناہ نہ چھوٹ رہا ہو تو مخاطب کو نیکی پر لگا دیں کہ سنن ترمذی کی روایت

میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گناہ کے فورا بعد کوئی نیکی کر لیا کرو کہ وہ نیکی اس گناہ کو مٹا دیتی ہے۔ تو عالم دین اور داعی کو چاہیے کہ گناہ گار کا ایمان اگر ابھی کمزور ہو کہ وہ گناہ نہ چھوڑ پا رہا ہو تو اسے یہ تجویز کرے کہ جب جب تم سے گناہ ہو تو کوئی نیکی کر لیا کرو جیسا کہ کچھ صدقہ کر لیا۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت کا بوسہ لے لیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا اور کہا کہ مجھ پر حد قائم کر دیں۔ اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا، اس نے بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی تو نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ کے سامنے وہ شخص دوبارہ پیش ہو گیا۔ تو آپ نے اسے فرمایا کہ کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھ لی ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں پڑھ لی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا گناہ اس نماز پڑھنے سے معاف ہو گیا ہے۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾۔ ترجمہ: نیکیاں، گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یعنی نماز نے تمہارے گناہ کو مٹا دیا ہے۔ تو اس شخص نے سوال کیا کہ کیا یہ بشارت کہ نیکی کرنے سے گناہ مٹ جاتا ہے، صرف میرے لیے ہے؟ تو آپ ﷺ نے کہا کہ نہیں، میری تمام امت کے لیے ہے۔

تو لوگوں کو اللہ سے متعلق کر دینا اور کرتے رہنا یہ دین کا کل حاصل ہے نہ کہ یہ کہ لوگوں سے گناہ ہو ہی نہ۔ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ متقی یہ ہیں: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ﴾ ترجمہ: وہ لوگ جو کہ اگر بے حیائی کے کسی کام کا ارتکاب کر بیٹھیں یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھیں [یعنی کوئی گناہ کر لیں] تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہ پر استغفار کرتے ہیں۔ تو قرآن مجید کی نظر میں متقی وہ نہیں ہے کہ جس سے گناہ نہ ہو بلکہ وہ ہے کہ جس سے گناہ ہو جائے تو توبہ میں دیر نہ لگائے۔ اور توبہ سے مراد محض استغفار کی تسبیح پھیرنا نہیں ہے بلکہ توبہ سے مراد گناہ پر دل سے شرمندگی ہو، پھر زبان سے استغفار کرے اور ساتھ ہی یہ ارادہ کر لے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کرے گا، بھلے اسی شام اس سے دوبارہ ہی ہو جائے کہ جس صبح اس نے توبہ کی ہو۔

ایک مذہبی دوست نے کہا کہ تمہارے اس پورے علمی مقدمے کا عنوان ہی غلط ہے یعنی "آسان

دین"۔ میں نے کہا کہ "آسان دین" تو رسول اللہ ﷺ کے الفاظ "الدین یسر" کا ترجمہ ہے۔اب یہ غلطی نکالنے نہ بیٹھ جایئے گا کہ "آسان دین" تو موصوف صفت ہے اور "الدین یسر" مبتدا خبر ہے۔ بد قسمتی سے ہم علماء اب ایسی ہی نقد کرنے کے قابل رہ گئے ہیں کہ جس میں مخالف فریق کے مقصود کلام پر ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات نہیں ہوتی لیکن ہم صرفی نحوی، گرامر و تلفظ کی غلطیاں خوب نکال رہے ہوتے ہیں۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دین کے بارے ہمارا تصور یہ ہے کہ وہ اتنا مشکل اور سخت ہے کہ ہمیں وہ لفظ بھی ہضم نہیں ہو پا رہا جو خود رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہے یعنی "آسان دین"۔ایک اور دوست نے کہا کہ آپ کا جواب لکھا جا رہا ہے۔میں نے کہا کہ ہاں ! "آسان دین" کے جواب میں "مشکل دین" لکھ دیں۔ مطلب آپ ذرا غور کریں کہ ہم دین کی تعبیر اور تشریح میں انسانی نفسیات کا ذرا سا بھی دھیان نہیں رکھتے کہ ایک طرف کہہ رہے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے تو انسانی فطرت اور طبیعت تو نرمی کو پسند کرتی ہے نہ کہ سختی کو۔ لہذا دین میں اصل نرمی ہے نہ کہ سختی البتہ سختی بعض صورتوں میں بعض تفصیلات کے ساتھ جائز ہے۔تو دین اسلام تو "آسان دین" ہی ہو سکتا ہے نہ کہ "مشکل دین"۔

اور توبہ ہمارے دین میں اتنا بڑا عمل ہے کہ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید نیکی کرنے سے بھی بڑا عمل گناہ کر کے توبہ کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اللہ کی قسم ! اگر تم گناہ نہ کرو گے تو اللہ عزوجل تمہیں لے جائے گا اور تمہاری جگہ ایک ایسی قوم کو پیدا کرے گا جو گناہ کر کے توبہ کرے اور اللہ عزوجل ان کو معاف فرمادے۔ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ گناہ کرنے ہیں اور نہ ہی یہ اس حدیث کا مفہوم ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ گناہ تمہاری تقدیر ہے لہذا دین کے نام پر ایسا بیانیہ (narrative) جاری کرو کہ جس میں گناہ گار کی کوئی جگہ ہو۔اگر تمہارے بیانیے میں گناہ گار کی جگہ نہیں ہے تو یہ تمہارا بیانیہ تو ہے، دین کا بیانیہ نہیں ہے۔ یہ امت بحیثیت مجموعی گناہ گاروں کی امت ہے لہذا ہمیں گناہ گاروں کے لیے بھی مفتی چاہییں اور وہ کوئی ہمارے جیسا گناہ گار ہی ہو سکتا ہے۔

کافی عرصہ پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ لبرل ازم اور جدیدیت کا جوابی روایتی بیانیہ ایک نہیں

ہے کہ یہ "السابقون الأولون" کے لیے اور ہے اور "أصحاب الیمین" کے لیے اور ہے جیسا کہ سورۃ واقعہ میں ان دونوں طبقات کے بیان میں فرق رکھا گیا ہے۔ اور یہ "ظالم لنفسہ" یعنی گناہ گار کے لیے اور ہے۔ "مقتصد" یعنی نیکوکار گناہ گار کے لیے اور ہے۔ اور "سابق بالخیرات" یعنی نیکیوں میں بہت آگے بڑھ جانے والے کے لیے اور ہے۔ قرآن مجید میں کسی بھی نبی کے امتیوں کے یہی تین درجات بیان ہوئے ہیں جیسا کہ سورۃ فاطر میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

صحیح مسلم ہی کی روایت میں ہے کہ قیامت والے دن اس شخص کو لایا جائے گا کہ جو سب سے آخر میں جہنم سے نکالا جائے گا اور سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔ اللہ عزوجل فرشتوں سے کہیں گے کہ اس کے صرف چھوٹے چھوٹے گناہ اس کے سامنے پیش کرو اور بڑے گناہوں کو ابھی چھپا لو۔ تو اسے کہا جائے گا تو نے یہ کیا... یہ کیا... اور یہ کیا۔ تو وہ اپنے ان تمام گناہوں کا اقرار کرے گا اور دل میں سوچ رہا ہو گا کہ اچھا ہوا کہ بڑے گناہ تو ریکارڈ میں نہیں آئے۔ تو اتنے میں اسے کہا جائے گا کہ اللہ عزوجل تیرے ہر گناہ کے بدلے میں تجھے نیکی عطا فرما رہے ہیں۔ وہ جب یہ سنے گا تو فوراً بول اٹھے گا کہ میں نے تو اتنے زیادہ گناہ کیے تھے، وہ سب مجھے یہاں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ تو یہ بیان فرما کر رسول اللہ ﷺ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اور تو اور اس دین میں تو زر خرید غلام تک سے اس قدر نرمی کا حکم ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ جس نے اپنے غلام (slave) کو تھپڑ مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس غلام ہی کو آزاد کر دے۔ تو ہمارے مفتیان کرام اور علمائے عظام کا المیہ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس دین کا علم نہیں ہے، ان کا المیہ یہ ہے کہ ان کا سوسائٹی سے تعامل (interaction) نہیں ہے۔ وہ اخلاقی اور دینی اعتبار سے معاشرے کے گرے پڑے طبقات میں بیٹھے نہیں ہیں لہذا انہیں ان کے مسائل کا نہ تو ادراک ہے اور نہ ہی احساس۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ دین کے نام پر جو سخت بیانیہ انہوں نے جاری کر رکھا ہے، وہ ان کے مدرسہ اور مسجد کی چار دیواری سے باہر نکل کر بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کہ باہر کا ماحول اور حالات بہت فرق ہیں۔ البتہ اسلامی تحریکوں سے یہ امید تھی کہ وہ چونکہ سوسائٹی میں نکل کر دعوت اور تبلیغ کا کام کرتی ہیں لہذا وہ حکمت اور فراست کا مظاہرہ کریں گی لیکن اب تو ان کے

کارکنان کی اکثریت بھی تشدد کی راہ پر چل نکلی ہے۔

پھر یہ بھی کہ علم دین کا یہ مزاج نہیں ہے کہ وہ فکری جمود کا شکار ہو۔ آپ لگے بندھے موقفات اور آراء کی پابندی کرنے پر علماء کو مجبور کریں، یہ ممکن نہیں ہے۔ چلیں جو لوگ تقلید کے قائل ہیں سو ہیں لیکن جو تقلید کو شر عظیم سمجھتے ہیں، ان میں سے کتنے اجتہاد کے قائل ہیں یا اجتہاد کر رہے ہیں؟ فکری جمود ہماری دینی اور علمی روایت کو ڈھا دینے کے مترادف ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ تقلید کے قائل ہیں، ان کے ہاں بھی اس قدر لچک موجود ہے کہ وہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ زمانے اور حالات کے بدل جانے سے فتوی بدل جاتا ہے۔ پھر ہر رائے کو شاذ کہہ کر اس کا تمسخر اڑا دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ شاذ رائے وہ نہیں ہے جو اکثریت کی مخالفت میں ہو کہ اکثریت تو کبھی بھی حق کا معیار نہیں رہی ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ کے بقول شاذ رائے تو وہ ہے کہ جس کا مصدر اور دلیل موجود نہ ہو۔ اور یہ شاذ رائے کی سب سے بہترین تعریف ہے۔

شاذ کی یہ تعریف بالکل بے کار تعریف ہے کہ شاذ رائے علماء کی جماعت یا اکثریت کے مخالف رائے کو کہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو امام ابن حزم رحمہ اللہ اپنی کتاب "الإحکام" میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنفیہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کے حوالے سے دو سو فقہی آراء ایسی جمع کر دی ہیں کہ جو ان ائمہ سے پہلے عالم اسلام میں کسی نے پیش نہیں کی تھیں۔ اچھا عالم دین کبھی دوسرے علماء کی جزئیات کا پابند نہیں ہو سکتا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے چالیس سے زائد مسائل میں ائمہ اربعہ سے اختلاف کیا ہے یعنی چاروں امام، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا فتوی ایک ہے اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا دوسرا ہے اور آج امت طلاق کے مسائل میں قانون سازی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ان فتاوی کے مطابق کر رہی ہے کہ جن میں انہیں چاروں ائمہ سے اختلاف ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب ان لوگوں سے جنگ کرنی چاہی کہ جنہوں نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تھا تو باقی تمام صحابہ ایک طرف تھے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے۔ تو علماء سے اختلاف کرنا بالکل بھی ناجائز نہیں ہے، چاہے وہ کتنی ہی اکثریت میں کیوں نہ ہوں۔

پھر شاذ اقوال اور فقہاء کی رخصتوں میں بھی فرق ہے، دونوں ایک نہیں ہیں۔ فقہاء نے بہت سے

مسائل میں عوام کے لیے رخصتیں نکالی ہیں بلکہ بعض فقہاء نے تو ایسے اصول دیے ہیں کہ جن پر رخصتوں کی بناء رکھی جا سکے جیسا کہ استحسان (equitable remedy) کا اصول ہے۔ پھر ایک دوست نے کہا کہ دین میں رخصت تو اصل نہیں ہے بلکہ عزیمت اصل ہے۔ تو اس بارے ہمیں یہ کہنا ہے کہ یہ بھی ہمارا غلط تصور ہے کیونکہ کبھی دین میں رخصت اصل ہوتی ہے اور کبھی عزیمت۔ اور اگر رخصت اصل ہو تو اسے حنفیہ کے ہاں "رخصت اسقاط" کہتے ہیں یعنی وہ رخصت جو عزیمت کے حکم کو گرادے یا ختم کر دے۔

علاوہ ازیں اس پر بھی غور کر لیں کہ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں فقہ شافعی عام کیوں ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ممالک بہت بڑے جزیرے ہیں یعنی چاروں طرف سے پانی میں ہیں۔ اور سمندری مخلوق کے کھانے کے بارے فقہ حنفی کی نسبت فقہ شافعی میں بہت ہی نرم رائے اور فتوی موجود ہے کہ جو چیزیں پانی سے باہر زندہ نہ رہ سکتی ہوں، وہ تقریباً سب حلال ہیں۔ اور فقہ حنفی میں سمندر کے جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے یا دو اور چیزوں کے بارے میں کچھ بحث موجود ہے۔ لہذا زیادہ پانی کے قریب شافعی فقہ پھیل گئی۔

پھر افریقہ میں غالب فقہ امام مالک رحمہ اللہ کی ہے کہ وہاں چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جنگل کے جانوروں کے کھانے کے بارے میں سب سے نرم رائے اور فتوی امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے یہاں تک کہ بعض مالکیہ کے نزدیک جنگلی درندوں کو کھانا حرام نہیں بلکہ ناپسندیدہ ہے اور بعض مالکی علماء نے تو جائز تک کہہ دیا ہے۔ تو فقہوں کے مختلف ممالک میں پھیلنے کی وجوہات جہاں سیاسی ہیں، وہاں جغرافیائی بھی ہیں کہ ایک ماحول کے مطابق اس فقہ کا اختیار کرنا وہاں کے لوگوں کے لیے مناسب تھا کہ جس فقہ پر عمل سے ان کی بنیادی ضرورتوں میں سہولت کا پہلو نکلتا تھا لہذا وہ فقہ اس علاقے میں عام ہو گئی۔

تو اکثریت سے اختلاف کرنا تو شروع سے ہی چلا آ رہا ہے، اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو علم کا مزاج ہے۔ لہذا جب تک آپ کتاب وسنت سے چمٹے ہوئے ہیں اور جب تک کہ آپ ان اصولوں سے جڑے ہوئے ہیں کہ جو دین کو سمجھنے کے لیے ضروری اور متفق علیہ (agreed

اصول ہیں کہ جن کا بیان اصول فقہ کی کتب میں موجود ہے تو اس وقت تک نہ تو آپ (upon) جدیدیت پسند ہیں اور نہ ہی ماڈرنسٹ، بھلے روایت پسندوں سے ہزار باتوں میں اختلاف کرلیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ فتوی دیا کہ طلاق بدعی بالکل واقع نہیں ہوتی یعنی وہ طلاق جو سنت طریقے سے نہ ہو، وہ طلاق ہوتی ہی نہیں ہے مثلاً تین طلاق ایک وقت میں دے دی ہیں تو ایک ہی طلاق ہو گی اور حیض کی حالت (menses) میں طلاق دے دی ہے تو یہ طلاق نہیں ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

ٹھیک ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے زمانے میں ان پر بہت نقد ہوا، علماء نے ان کے خلاف حکمرانوں کے کان بھر کر انہیں جیل میں بھی قید کروایا جیسا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے جب برصغیر میں تقلیدی جمود کے خلاف اجتہادی کام کیا تو ان پر بھی بہت نقد ہوا بلکہ ان پر قاتلانہ حملے تک ہوئے لیکن بعد میں ان کی فکر کو ایسی قبولیت عامہ (acceptance) حاصل ہوتی چلی گئی کہ یہی لوگ یعنی ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہما اللہ بعد کے زمانے والوں کے لیے امام بن گئے۔ اور اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ ان حضرات کی فکر زمانے کے لیے نئی ہونے کے باوجود روایت سے جڑی ہوئی تھی لہذا وہ فکر تاریخ کے اوراق میں گم نہیں ہوئی بلکہ اسلامی معاشروں نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔

مجھے یہی بات ایک مرتبہ غامدی صاحب کے بعض شاگردوں نے بھی کہی تھی کہ ہماری فکر کو بھی کچھ عرصہ بعد وہی قبولیت عامہ (acceptance) حاصل ہو جائے گی جو ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی فکر کو کافی عرصہ بعد حاصل ہوئی تو میں نے انہیں جواب میں یہی کہا تھا کہ آپ کی فکر روایت (tradition) سے جڑی ہوئی نہیں ہے، آپ لوگ روایت کو اپناتے (own) نہیں ہو لہذا آپ کے لیے زیادہ بہترین مثال معتزلہ یا ماضی قریب میں سر سید احمد خان صاحب کی ہے۔ سر سید احمد خان کے اخلاص میں شک نہیں ہے لیکن آج ایک ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کی فکر کو جاننے والے تو ہوں گے لیکن ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ دین ایک علمی روایت ہے کہ جو نسل در نسل ہم تک منتقل ہوا ہے۔ میں چودہ صدیوں میں فقہاء اور علماء کی کاوشوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے کیسے یہ دعوی کر سکتا ہوں کہ اب مجھ سے دین سیکھو، پچھلوں کی ضرورت باقی نہیں رہ

گئی۔ہاں ! البتہ میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بعد میں آنے والے اچھے علماء نے پہلے سے موجود علمی ذخیرے میں اضافہ کیا ہے۔تو اگر ہم بھی یہ کر کے دکھادیں تو معاشرے کی ایک بڑی علمی ضرورت پوری ہو جائے گی۔تو میرے نزدیک کرنے کا اصل علمی کام یہی ہے کہ اپنی علمی روایت میں اضافہ کریں اور اس روایت کی پیشکش (presentation) کو بہتر سے بہتر بنائیں۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تمام انبیاء علاتی بھائی (paternal brothers) ہیں، جن کا باپ یعنی دین ایک ہے جبکہ مائیں یعنی شریعتیں جدا جدا ہیں۔تو تمام انبیاء کا دین یعنی اسلام کے اصول (principles) ایک ہی رہے ہیں جیسا کہ آدم علیہ السلام سے رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء کو توحید کا حکم دیا گیا اور تمام امتوں کو دین میں تفرقہ ڈالنے سے منع کیا گیا۔البتہ تمام انبیاء کے ہاں شریعتیں یعنی زندگی گزارنے کا قانون اور اس کی تفصیلات میں اختلاف رہا ہے۔مثال کے طور پر تمام انبیاء کے ہاں نماز پڑھنے کا حکم تھا، یہ تو اصولی بات ہو گئی لیکن نماز کیسے پڑھنی ہے، اس کی تفصیلات میں اختلاف رہا ہے، یہ قانون اور شریعت کی بحث ہو گئی۔

تو اصل حیثیت اصولوں کی ہے نہ کہ جزئیات اور فروعات کی۔جزئیات اور فروعات میں اختلاف ہونا تو ایک لازمی امر ہے۔پس یہ نعرہ لگانا کہ "الاعتصام بالکتاب والسنۃ علی فہم السلف الصالحین" یعنی کتب وسنت کو تھام لو لیکن سلف صالحین کے فہم کے ساتھ، بھی درست نعرہ نہیں ہے۔جب سلف صالحین کا فہم ایک نہیں ہے تو وہ حجت (binding) کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر سلف کا فہم حجت ہوتا تو ایک صحابی دوسرے صحابی سے کسی مسئلے میں اختلاف نہ کرتا۔جب ان کا فہم آپس میں ایک دوسرے کے لیے حجت نہیں ہے تو ہمارے لیے کیسے ہو گیا۔اسی طرح اگر سلف صالحین کا فہم حجت ہوتا تو تابعین، صحابہ سے اختلاف نہ کرتے۔امر واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں علماء اپنے سلف صالحین یعنی پہلے گزرے ہوئے علماء سے اختلاف کرتے چلے آئے ہیں۔تو صحیح جملہ یہ ہے: "الاعتصام بالکتاب والسنۃ علی منہج فہم السلف الصالحین" یعنی کتب وسنت کو تھام لو، اس منہج کے مطابق کہ جس منہج کے مطابق سلف صالحین کتاب وسنت کو سمجھتے تھے۔تو منہج حجت ہے نہ کہ خود فہم۔اور منہج سے مراد اصول دین ہیں نہ کہ فروعات۔

پس روایت پسند وہ ہے جو اصول استدلال یعنی کتاب و سنت سے دلیل کیسے پکڑنی ہے، میں سلف کے منہج پر ہو نہ کہ یہ کہ وہ سلف کے فہم پر ہو۔ سلف تو خود ایک دوسرے کے فہم پر نہیں ہیں یا جدید دور کے لاکھوں مسائل ایسے ہیں کہ جن میں سلف کا فہم ہمیں ملنے سے رہا کہ یہ مسائل ان کے زمانے میں تھے ہی نہیں تو ان کا فہم کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں گے؟ غامدی صاحب سے ہمارا یہی اختلاف ہے یعنی اصولوں میں اختلاف ہے۔ ہم نے غامدی صاحب پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں ان کے اصولوں پر نقد کی ہے کہ ان کے اصولوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ باقی جزئیات اور فروعات میں اختلاف سے بچنا تو ممکن نہیں ہے۔ روایت پسندوں کے نزدیک چار بنیادی مصادر دین (sources of Sharia) ہیں یعنی جن چیزوں سے دین اسلام ثابت ہوتا ہے، وہ قرآن مجید، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع [consensus] اور قیاس [analogical deduction] کے اصول ہیں جبکہ اس کے برعکس غامدی صاحب اپنے تصور دین کا بنیادی مقدمہ جن چار اصولوں کی بنیاد پر کھڑا کرتے ہیں، وہ فطرت کے بنیادی حقائق، سابقہ آسمانی کتابیں، ابراہیم علیہ السلام کی سنت اور قرآن مجید ہے۔ تو یہ اصولوں کا اختلاف ہے۔

اگر توحید و شرک کی بات کریں تو مجھے بتلائیں غامدی صاحب اور اہل حدیثوں کے موقف میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی تصوف کو متوازی دین کہہ رہے ہیں اور یہ بھی۔ یہاں تو دونوں متفق ہیں۔ تو جزئیات میں اتفاق اور اختلاف ہر جگہ موجود ہے۔ اس میں ایک دوسرے پر رد ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی بڑا اختلاف اور اتفاق نہیں ہے۔ بڑا اتفاق اس کو کہتے ہیں جو اصولوں میں اتفاق ہو اور بڑا اختلاف اس کو کہتے ہیں جو اصولوں میں اختلاف ہو۔ پھر حدیث غامدی صاحب کے نزدیک اس طرح سے حجت نہیں ہے جیسا کہ ہمارے نزدیک ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک حدیث سے اگر قرآن کے کسی عقیدے اور عمل کی تفسیر کرنا ہو تو یہ تو درست ہے یعنی یہاں تو حدیث قبول کی جائے گی لیکن اگر کوئی عقیدہ اور عمل ایسا ہے جو قرآن مجید میں سرے ہی سے بیان نہیں ہوا ہے اور صرف حدیث میں بیان ہوا ہے تو ایسا عقیدہ یا عمل ہم دین کے نام پر قبول نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث سے اگر قرآن مجید کے کسی حکم پر اضافہ ہو رہا ہو یا حدیث قرآن مجید کے کسی حکم میں

تحدید یا تخصیص پیدا کر رہی ہو تو بھی ایسی حدیث دین کے نام پر قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ انہوں نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی احادیث کا اس لیے انکار کر دیا کہ یہ قرآن مجید کے حکم پر اضافہ ہیں کہ قرآن مجید میں زنا کی سزا سو کوڑے بیان ہوئی ہے۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ روایت پسندوں میں بھی مختلف مکاتب فکر ہیں کہ جن کے منہج استدلال میں کچھ فرق بھی ہے۔ پس منہج استدلال یا اصول فقہ یا اصول استدلال بھی سب کے سب متفق علیہ (agreed upon) نہیں ہیں، ان میں سے کچھ متفق علیہ ہے، وہ حجت ہیں جیسا کہ کتاب وسنت اور اجماع وغیرہ اور کچھ میں اختلاف ہے جیسا کہ مصلحت، استحسان اور استصحاب وغیرہ۔ تو روایت پسند کہلوانے کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم متفق علیہ اصولوں کی پابندی کی جائے۔ تو روایت ایک وسیع اصطلاح ہے کہ جو جدیدیت کے مقابلے میں استعمال ہو رہی ہے یعنی یہ دین ہمیں ایک روایت سے ملا ہے جو چودہ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اب میں اس روایت سے اپنا ناطہ جوڑنا چاہتا ہوں یا توڑنا چاہتا ہوں، اس سے فیصلہ ہو گا کہ آپ روایت پسند ہیں یا جدیدیت پسند۔ اور روایت سے جڑنے کا مطلب ان اصولوں کی پاسداری ہے جو تمام اہل روایت کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں ہی اہل الاثر اور اہل الرائے کے نام سے دو اجتہادی مکاتب فکر وجود میں آ گئے تھے کہ جن کے منہج اجتہاد میں بھی فرق تھا اور اس پر ہم نے اپنے ایک تفصیلی مقالہ میں گفتگو بھی کی ہے۔ آج بھی آپ دیکھ لیں کہ جنہیں ہم روایت پسند علماء میں شمار کرتے ہیں تو ان میں جزئیات کے اختلاف کے ساتھ منہج کے اختلافات بھی موجود ہیں۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کے فتاوی دیکھ لیں تو ان میں شدت اور سختی کا عنصر واضح طور نظر آتا ہے جیسا کہ انہوں نے کہا کہ عورتوں کے لیے سونے کے ایسے زیورات پہننا حرام ہیں جو حلقے کی صورت میں ہوں مثلاً انگوٹھی، کڑا، چوڑی، بریسلیٹ اور نیکلیس وغیرہ۔ اسی طرح انہوں نے کہا کہ وضو میں ایک مد یعنی دونوں ہاتھوں کے ڈیڑھ چلو سے زائد پانی استعمال کرنا حرام ہے۔ اگرچہ کچھ مسائل میں وہ نرمی کی طرف بھی گئے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ لازم نہیں ہے بلکہ پسندیدہ ہے۔ لیکن ہم ان کے

فتاوی کے ایک عمومی مزاج کی بات کر رہے ہیں۔ اسی طرح شیخ یوسف القرضاوی کو دیکھ لیں تو ان کے فتاوی میں نرمی اور سہولت کا پہلو نظر آتا ہے، اگرچہ ہمیں بھی شیخ کے فتاوی سے اختلافات ہیں لیکن جس معاشرے میں وہ بیٹھے ہیں، اس معاشرے میں شاید ایسے ہی فتاوی قابل عمل ہو سکتے ہیں یعنی یورپ کے مسلمانوں کے لیے۔ واضح رہے کہ شیخ قرضاوی "یورپین کونسل برائے فتوی و تحقیق" کے صدر رہیں۔

تو علماء کا منہج یا فروعات میں ایسا اختلاف تو باقی رہے گا اور اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ کہ ہر دو طرف سے لوگ اپنی بات کو اچھے انداز سے بیان کر دیں اور مدلل انداز میں دوسرے کو جواب بھی دے دیں تو اس میں کسی کو کیا اختلاف ہو سکتا ہے کہ علماء شروع ہی سے ایک دوسرے کا رد کرتے چلے آئے ہیں لیکن علمی رد کی بجائے دوسرے کی شخصیت کو مسخ کرنا، یا اس پر طعن وطنز کرنا، یا اس پر فتوے لگانا تو یہ وہ اسلوب ہے کہ جس کا ہم ہمیشہ رد کرتے آئے ہیں کہ یہ دین حق کی حفاظت کے نام پر محض نفس پرستی ہے اور کچھ نہیں۔ کوئی سنجیدہ عالم دین اور خدا سے ڈرنے والا اس رویے کا حامل نہیں ہو سکتا۔ بھئی ہمارے نزدیک خدا سے زیادہ ڈرنے والا عالم دین وہ نہیں ہے جو سجدے میں آنسو بہا رہا ہو بلکہ وہ ہے جو منبر پر بیٹھے ہوئے ڈر رہا ہو کہ کسی کا رد کرتے ہوئے کوئی ایسا لفظ زبان سے نہ نکل جائے جو خدا کو ناراض کر دے۔ اور زیادہ ڈرنے والا وہ ہے کہ جو دار الافتاء کی مسند پر بیٹھے ہوئے اس طرح اللہ سے ڈر رہا ہو کہ فتوی لکھتے ہوئے اس کا قلم کانپ رہا ہو کہ اللہ کے دین کے حوالے سے کوئی ایسا لفظ نہ لکھ بیٹھوں جو میری عاقبت خراب کر دے۔ آج ہمارے دل سے زیادہ ہماری زبان اور ہمارے قلم کو حالت احسان کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم زبان اور قلم کا احسان حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک بات کا التزام کر لیں کہ جس کا بھی رد کریں، اگلی نماز میں اس کے لیے اور اپنے لیے استغفار اور دعا ضرور کریں اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک کہ غصہ ختم نہ ہو۔

آخر میں اطلاعاً عرض ہے کہ ہمارے دوست حافظ خضر حیات صاحب نے پہلے بھی ایک مرتبہ تاریخ اہل حدیث کے موضوع پر ہماری بعض تحریروں کا تعاقب کیا تھا اور اچھے اسلوب میں کیا تھا اور ہم نے بھی اپنی فیس بک وال (wall) سے ان کے نقد کو شکریہ کے ساتھ پیش کیا تھا۔

لہذا ہمارے ان مضامین کے حوالے سے کوئی کام کارد اگر ملنے کا امکان ہے، تو خضر حیات صاحب کی وال پر آتے جاتے رہیں، ان کی نقد سے آپ کے سامنے مسئلے کی تصویر کا دوسرا رخ بھی آ جائے گا۔ باقی نقد کرنے والوں کی اکثریت ایسی ہی ہے کہ ان کا نقد پڑھنا تو کجا دیکھنے کے لائق بھی نہیں ہوتا ہے۔ قابل قدر نقد وہی ہوتی ہے جو اگلے کی اصولی بنیادوں کو مخاطب کرے نہ کہ یہ کہ اس جزیے کا یہ جواب ہے اور اس فرع کی یہ شرح ہے۔ ہماری اس تحریر کا مقدمہ کچھ اصولوں کی بنیاد پر کھڑا ہے تو ان اصولوں کو ہلا دیں تو یہ مقدمہ خود ہی ہل جائے گا۔ اور اگر آپ ان اصولوں کو سمجھ نہ پائے یا ان پر گفتگو نہ کر سکے اور یہی کہتے رہے کہ اس حدیث کا یہ جواب ہے اور اس روایت کا یہ معنی ہے تو آپ کی اس نقد سے علمی بحث آگے نہیں بڑھے گی البتہ نقد کا فریضہ پورا ہو جائے گا کیونکہ احادیث اور روایات تو ابھی اور بھی بے شمار ایسی ہیں جو اس مقدمے کے حق میں بیان کی جا سکتی ہیں۔

باقی نقد سے گھبرانا نہیں چاہیے، نقد کا ہونا بہت ضروری ہے کہ اسی سے علمی مباحث میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے یہ تصویر کا ایک رخ ہے، مکمل تصویر نہیں ہے۔ لیکن یہ تصویر کا وہ رخ ضرور ہے کہ جسے علماء کی طرف سے لوگوں کے سامنے پیش نہیں کیا گیا لہذا مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تصویر کے اس رخ کو بھی لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ دین کا جو روایتی تصور اس وقت سوسائٹی میں عام ہو چکا ہے، اس میں اعتدال پیدا ہو۔ اللہ عزوجل ہم سب کی علمی کاوشوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے، آمین۔